یٰس اختر مصباحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادتِ بابری مسجد

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی و مہتمم "دارالقلم" ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
بانی رکن "المجمع الاسلامی" مبارک پور

نام کتاب	:	شہادتِ بابری مسجد
مؤلف	:	یٰسٓ اختر مصباحی
زیر اہتمام	:	دار القلم دھلی
طبع اول	:	۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء
طبع دوم	:	۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء
صفحات	:	ایک سو بارہ (۱۱۲)
ناشر	:	رضوی کتاب گھر

تھدیہ

ان ہزاروں شہداء کے نام

جنہوں نے بابری مسجد کی حُرمت پر اپنی جان قربان کردی

ان کروڑوں اسلامیانِ ہند کے نام

جن کی رُوحوں کا اضطراب بابری مسجد کا طواف کر رہا ہے

اور اس محراب و منبر کے نام

جسے بظاہر ذکر و عبادتِ الٰہی سے محروم کر دیا گیا ہے

لیکن

یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یٰسٓ اختر مصباحی

فہرست

گزارش احوال واقعی

صوبہ اُترپردیش کا شہر اجودھیا ضلع فیض آباد اپنی قدامت اور مذہبی و تاریخی اہمیت کے لحاظ سے محتاجِ تعارُف نہیں۔ سرجو ندی کے کنارے آباد یہ شہر اس وقت ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں تقریباً پانچ ہزار مسلم آبادی ہے۔

مشہور ہندو روایات کے مطابق رام چندر کی پیدائش یہیں ہوئی۔ البتہ مورخین کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ اجودھیا اسی جگہ آباد ہے جہاں رام چندر کی پیدائش ہوئی تھی یا وہ آبادی کہیں اور تھی جسے قدیم تاریخ میں اجودھیا کہا جاتا تھا اور یہ نیا شہر بعد کے کسی زمانے میں آباد ہوا ہے۔ اس شہر کو بدھ مت اور جین مت میں بھی تقدس کا درجہ حاصل ہے۔

زبانی طور پر مسلم روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت شیث علیہما السلام کی بھی یہاں قبریں موجود ہیں۔ مگر مذہب و تاریخ کی مستند کتابوں سے اس روایت کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بچپن اجودھیا ہی میں گزرا۔ قدوائی خاندان کے مورثِ اعلیٰ قاضی قدوہ کی قبر یہیں ہے۔ یہاں بہت سے علماء، و اولیاء، و صوفیائے کرام کی قبریں اور بہت سی تاریخی مساجد بھی پائی جاتی ہیں جن کا اب کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ مُرورِ زمانہ نے انہیں شکست و ریخت کی منزل سے دوچار کر دیا ہے۔ خواجہ حالی نے دہلی کا مرثیہ لکھتے ہوئے جو کہا تھا اس کا مصداق شہر اجودھیا کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔

چپہ چپہ میں ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

انگریزوں کی تاریخ گری

بابری مسجد جسے ظہیرالدین محمد بابر کے حکم سے اس کے ایک مشیر و سپہ سالار میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا کے اندر تعمیر کرایا تھا اور اس میں نماز و عبادت کا سلسلہ صدیوں جاری رہا۔ انگریز فتنہ گروں نے جب اودھ کا رُخ کیا تو ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کر کے اپنے اقتدار کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کو توڑ کر تعمیر کی گئی ہے۔ فتنہ پرداز انگریز کا نام ہے پی کارنیگی۔

ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس

ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کی بنیاد بالترتیب ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۵ء میں ڈالی گئی۔ اور ان دونوں تنظیموں نے نہایت منظم اور منصوبہ بند طریقے سے ہندوؤں کو مسلمانوں سے الگ رکھنے، ہندو قومیت کے جذبات کو ہوا دینے اور مسلمانوں پر مسلط کرنے کی خفیہ نظریاتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۴۸ء میں مسٹر گاندھی کے قتل کے بعد آر ایس ایس پر پہلی بار پابندی عائد کی گئی۔ اور ہندوستان میں اسے رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

سیاسی محاذ پر کام کرنے کے لئے آر ایس ایس نے جن سنگھ کو جنم دیا جس کی ترقی یافتہ شکل بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔ اور وشو ہندو پریشد نے بھی آر ایس ایس ہی کی سرپرستی و نگرانی میں اپنے بال و پر نکال رکھے ہیں۔ ان سب کی ذہنیت یکساں ہے اور اسے جاننے کے لئے یہ تازہ بیان کافی ہے۔

نئی دہلی۔ یکم جنوری (یو۔ این۔ آئی) اکھل بھارتیہ سنت سمیتی کے صدر سوامی وام دیو اور جنرل سکریٹری سوامی مکتانند نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ مجوزہ مسجد بابر کے نام پر نہیں ہونی چاہیئے جو ایک حملہ آور اور ہندوستان کو لوٹنے والا تھا۔

انہوں نے کہا جو لوگ بابر کے نام پر مسجد بنائے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ ملک کے غدار ہیں۔

(روزنامہ قومی آواز نئی دہلی۔ ۲ر جنوری ۱۹۹۳ء)

تقسیم ہند اور اس کے اثرات

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد مُسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ پاکستان کے حصے میں آیا اور پنجاب، بنگال، بہار، دلّی، مغربی یوپی کے بھی بہت سے مسلمان پاکستان منتقل ہوگئے۔ پھر بھی کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں نے ہندوستان ہی کو اپنا مستقل وطن بنایا۔

انتہاپسند ہندو باقی ماندہ ہندوستانی مسلمانوں کو ختم تو نہیں کر سکتے تھے مگر ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوئی کہ مسلمان یہاں سر جھکا کر دبے کچلے پس ماندہ لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ تعلیم، تجارت، صنعت، ملازمت وغیرہ میں ان کا کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح کے خیالات میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ جن مسلم سلاطین نے ان کے مبینہ مندروں کو توڑ کر وہاں مسجدیں بنائی ہیں۔ انہیں پھر دوبارہ اصل شکل میں لاکر اب مندر بنادیا جانا چاہیئے۔ اور اس کے لئے سرفہرست یہ تین مقامات ان کے ذہن میں رچے بسے تھے۔ اجودھیا، متھرا، کاشی۔ اس کے لئے عملی قدم اٹھانے کا کام اجودھیا سے ہوا کہ ۲۲/۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں بابری مسجد اجودھیا میں مورتیاں رکھ دی گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اقدام براہ راست تقسیم ہند اور قومی عصبیت کا نتیجہ تھا۔

سیکولر اسٹیٹ یا ہندو راشٹر

تقسیم کے بعد کانگریس نے ہندوستان کو سیکولر اسٹیٹ بنایا جب کہ وہ اسے ہندو راشٹر بھی بنا سکتی تھی۔ سیکولر اسٹیٹ بنائے جانے کا داعیہ یہ تھا کہ مسلم اقلیت تو اپنی جگہ رہی۔ خود ہندوؤں کے اندر اتنے گروہ اور طبقات ہیں اور ان کے معتقدات و نظریات میں اتنا تضاد ہے کہ ہندو راشٹر کی کوئی بھی بنیاد تلاش کرنا اور اس کے مطابق دستور و آئین ترتیب دینا ایک خیالی مفروضہ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

ہندوستانی جمہوریت و سیکولرزم جس میں سبھی ادیان و مذاہب کو یکساں حقوق

حاصل ہیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ سبھی قومیں اپنے مذہبی ارکان اور امتیازات و تشخصات کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔ انہیں عبادت خانے بنانے اور اپنے دینی و تعلیمی مراکز قائم کرنے کی مکمل اجازت ہے۔

یہ راستہ خود ہندو لیڈروں کا اختیار کیا ہوا ہے اور ان کی اکثریت نے اسے پسند کیا ہے۔ اور اسی میں ہندوستان کی بقا و سلامتی اور تعمیر و ترقی کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

سنگھ پریوار کی منزل

آر ایس ایس اور اس کے ہم خیال افراد نے تقسیم کے بعد ہی سے اپنی زیر زمین سرگرمیاں جاری رکھیں اور ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھتی رہیں۔ اب اس وقت وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کا نیا جارحانہ رُخ جو سامنے آیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سنگھ پریوار کی اصل منزل کیا ہے۔

یہ منزل نہ رام بھگتی ہے نہ اجودھیا، نہ شیو بھگتی ہے نہ کاشی، یہ کرشن بھگتی ہے نہ متھرا۔ ان کی منزل صرف اور صرف دہلی ہے۔ جہاں وہ قانون و انتظام کا گلا گھونٹ کر آئین ہند کو منسوخ کر کے پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ لال قلعہ پر ان کا بھگوا جھنڈا لہرایا جا سکے۔

ابھی چند دنوں پہلے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی نے ماتا ٹیلہ (جھانسی) کے سرکاری مہمان خانہ سے دیے گئے اپنے انٹرویو میں یہ نقطہ نظر واضح کر دیا ہے اور صاف الفاظ میں ہندو راشٹر کے قیام کے نصب العین کی بھرپور وکالت کی ہے۔

غلامی کی نشانیاں

مسلم حکمرانوں کی جو بھی مذہبی اور تاریخی عمارتیں ہیں وہ انتہا پسندوں کی نظر میں غلامی کی نشانیاں ہیں جنہیں وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ پہلے مرحلہ میں وہ مساجد کو نشانہ بنا رہے ہیں اور دوسرے مرحلہ میں تاریخی عمارتوں کو منہدم

کر دینا چاہتے ہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد کے بعد اب کاشی کی گیان باپی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ کی طرف ان کی نگاہیں اٹھ رہی ہیں۔ اور قطب مینار، لال قلعہ و تاج محل وغیرہ بھی ان کے نشانے پر ہیں۔ تاریخ کا الٹا سفر کر کے وہ پھر ہندوستان کو دور وحشت وظلمت میں لے جانے پر آمادہ و کمربستہ ہیں۔ اور انہیں ہوش اس وقت آئے گا جب بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے بھی پوری طاقت کے ساتھ یہ مطالبہ شروع کر دیں گے کہ ہندوؤں کے ہاتھوں ہمارے جو مندر توڑے گئے ہیں وہ ہمیں پھر واپس ملنے چاہئیں۔

مسجد اقصیٰ سے بابری مسجد تک

صلیبی وصیہونی سازشوں کا جال اب ہندوستان میں بھی پھیلتا جا رہا ہے اور ان کی سازشوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اس موقع پر یہ چونکا دینے والا انکشاف پڑھنے کے لائق ہے۔

۱۳ر دسمبر ۹۲ء کو بی بی سی ٹیلی ویژن نے کچھ دانشوروں کا مذاکرہ "اللہ کے نام سے" پیش کیا۔ اس موقع پر سامعین میں سے ایک امریکی پروفیسر کھڑا ہوا اور اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔

دوستو! میں مساجد پر اسپیشلسٹ ہوں۔ دنیا بھر کی تقریباً تیس ہزار سے زیادہ مسجدوں کا مطالعہ اور اسٹڈی کر چکا ہوں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یروشلم سے بوسنیا اور پھر بوسنیا سے اجودھیا تک مسجدوں کو نقصان پہنچانے کی ایک زبردست مہم چلائی جا رہی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اس مہم کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مسجد اقصیٰ کے انہدام کی کئی کوششیں ہو چکی ہیں۔

(ہفت روزہ بلٹز بمبئی

۲ر جنوری ۱۹۹۳ء)

بابری مسجد اور دیگر مقبوضہ مساجد کا فرق

عام طور پر بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ تقسیم کے وقت ہزاروں مساجد غیر آباد و ویران ہوگئیں۔ ان پر غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا اور آج بھی وہ ان کے تصرف میں ہیں، تو ان مساجد کو نظر انداز کر کے صرف بابری مسجد ہی کو کیوں مسلمان اپنی توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز بنا رہے ہیں؟

میرے خیال میں یہ موازنہ صحیح نہیں، کیوں کہ دیگر مساجد پر ہیجان انگیز حالات میں شرپسندوں نے قبضہ کرلیا اور مسلمان اس وقت کچھ مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان پر قبضہ اور ان کے اندر پوجا کا کوئی عدالتی فیصلہ نہیں۔ اور یہاں بابری مسجد کا تالا فیض آباد لوکل کورٹ کے ذریعہ یکم فروری ۱۹۸۶ کو کھولا گیا اور پھر عام پوجا کی جانے لگی۔ اس عدالتی حکم نے مسلمانانِ ہند کو سخت برافروختہ کردیا اور وہ غصہ میں آکر احتجاج کرنے لگے۔

اجودھیا کی مختصر سی مسلم آبادی مقامی شرپسندوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ اس کا بھی انتہا پسندوں نے فائدہ اٹھایا اور رام کے نام پر انہوں نے ہندو جذبات کو بھڑکا کر اپنا اثر و رسوخ جمایا۔ ساتھ ہی بابر کو حملہ آور کی شکل میں پیش کر کے اپنی وطن پرستی کے جذبات بھی ابھارے۔ ان سب چیزوں نے مل کر اس مسئلہ کو ایسا نازک اور حساس معاملہ بنا دیا کہ سارا ہندوستان اس کی زد میں آگیا۔ اس کے در و دیوار لرز اٹھے۔ تین مرکزی حکومتیں اس کی وجہ سے گر گئیں۔ اور ابھی آئندہ نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔

مقدمہ شاہ بانو

۱۹۸۵ء، ۱۹۸۶ء میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلہ میں نفقۂ مطلقہ کا حکم دیا تھا۔ مسلمانانِ ہند نے بڑے منظم اور طاقتور انداز میں اس فیصلہ میں ترمیم کا مطالبہ کیا اور پھر پارلیمنٹ نے ایک

بل کے ذریعہ نیا قانون پاس کر دیا۔ کچھ شرعی نقص کے باوجود یہ بل کارگر ثابت ہوا اور مسلمانوں کا احتجاج رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

اس مسئلہ کا تعلق ہندوؤں سے کچھ بھی نہیں تھا مگر نہ جانے انہیں یہ بات کیوں بری لگی کہ وہ اسے بنیاد بنا کر مسلمانوں کی منھ بھرائی کا حکومت کے سر الزام رکھنے لگے اور اخباری اطلاعات کے مطابق راجیو گاندھی کے دور میں ارون نہرو کے اشارہ پر ویر بہادر سنگھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے مشورہ سے ہندوؤں کی منھ بھرائی کی پالیسی اختیار کی گئی اور پارلیمنٹ میں نفقہ مطلقہ سے متعلق بل پاس ہونے سے پہلے ہی اچانک یکم فروری ۸۶ء کو بابری مسجد کا تالا کھلوا کر ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس کی تشہیر بھی کر دی گئی۔

علماء کرام کا موقف

علماء کرام نے نہایت بصیرت و فراست کے ساتھ بابری مسجد کے مسئلہ پر اپنی رائے دی کہ مسلمانانِ ہند ہوش و گوش سے کام لیں اور جذبات کی رو میں آکر کوئی بھی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو مستقبل میں خود انہیں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔ ان کی رائے کے یہ حصے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

(۱) بابری مسجد کے تحفظ و بازیابی کے لئے آئینی و قانونی جد و جہد جاری رکھی جائے۔ اسمبلی و پارلیمنٹ کے اندر اس کے لئے مؤثر آواز اٹھائی جائے۔ اور ذمہ دار لیڈروں سے مل کر انہیں اپنے موقف سے آگاہ کیا جائے۔

(۲) شاہ بانو کیس میں ہماری جد و جہد کا رُخ حکومتِ ہند کی طرف تھا۔ اس کا عام ہندوؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ بابری مسجد کے ساتھ عام ہندوؤں کے جذبات جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے سڑکوں پر آکر کوئی ایسا احتجاج و مظاہرہ نہ کیا جائے جس کی وجہ سے براہ راست عام ہندوؤں سے کوئی ٹکراؤ اور خوں ریزی کی نوبت پیدا ہو۔

(۳) بابری مسجد کے کسی جز سے کسی قیمت پر دست برداری کی کوئی بات نہ کی جائے

ظلماً اگر مسجد شہید کر دی جائے یا اس پر قبضہ کر لیا جائے جب بھی اس کا کوئی حصہ کسی کو دینے اور منتقل کرنے پر کوئی رضامندی کا نہ ظاہر کی جائے۔

(۴) اگر خدانخواستہ اس کی ایک انچ بھی زمین دینے پر کسی نے رضامندی ظاہر کی تو اس کا یہ فعل خلاف شرع ہوگا۔ اور آئندہ کے لئے مخالفین اسے نظیر بنا کر دوسری مساجد کے لئے بھی طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنے لگیں گے۔ اور شرعی و قانونی کسی طرح کی کوئی رکاوٹ کھڑی کرنا ہمارے بس سے باہر ہو جائے گا۔

(۵) ظلماً مسجد پر قبضہ یا اس کی شہادت کے بعد بھی مسجد کی زمین مسجد ہی رہے گی اور اس پر مسلمانوں کا دعویٰ استحقاق ہمیشہ باقی رہے گا۔

مسلم لیڈروں کا رول

مسلم لیڈروں نے یکم فروری ۸۶ء کے بعد نہایت گرما گرم بیانات دے۔ جن کا عام مقرروں نے بھی تعاون کیا۔ اردو صحافت بھی پیچھے نہیں رہی۔ کچھ ہفت روزے خاص طور پر اس مسئلہ کو اچھالنے میں پیش پیش رہے۔

ان سب کی نیتوں پر ایک ساتھ شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جنہوں نے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ تحریک بابری مسجد میں جوشیلے انداز سے حصہ لیا۔ انہیں یقیناً بارگاہ رب العزت میں سرخروئی اور سرفرازی حاصل ہوگی۔

مگر تحفظ و بازیابی مسجد کا مسئلہ نہایت نازک و حساس اور دور رس نتائج کا حامل تھا اس لئے بہت ہی تدبر و دور اندیشی اور اعتدال و توازن کے ساتھ مسلم لیڈروں کو ملک کی رائے عامہ ہموار کرنی چاہئے تھی۔ اور پہلے ہی قدم پر انہیں سوچ لینا چاہئے تھا کہ ہمارا قدم منزل کی طرف جا رہا ہے یا منزل سے دور ہو رہا ہے۔

میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے کوتاہ اندیش، خود غرض اور مفاد پرست سیاست دانوں نے اس مسئلہ کو اپنی شہرت و سیاست کا ذریعہ بنایا۔ اور اس مسئلہ کو الجھاتے اور باقی رکھنے کی انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور

پر بھرپور کوشش کی۔ اور اپنی جذباتی خطابت و بیان بازی سے ہر شہر اور دیہات کے کوچہ و بازار کا ماحول آتش فشاں بنا دیا۔

اجودھیا مارچ اور تقریبات ۲۶ رجنوری کا بائیکاٹ

بابری مسجد کانفرنس دہلی منعقدہ ۲۲ ، ۲۳ ر دسمبر ۸۶ء نے اپنی تجاویز میں دو تجویزیں خاص طور پر پاس کیں کہ مسئلہ اگر حل نہیں ہوتا تو نماز کے لئے مسلمانان ہند اجودھیا مارچ کریں گے اور تقریبات ۲۶ رجنوری کا بائیکاٹ بھی کریں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلم قیادت نے اب تک اتنا غیر دانشمندانہ اور عاقبت نا اندیشانہ فیصلہ کوئی اور نہیں کیا ہوگا۔ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی اور ہفت روزہ اخبارِ نو دہلی وغیرہ کے ذریعہ میں نے ان دونوں فیصلوں کے خلاف اپنا بیان دیا تھا جنہیں آپ آگے کے صفحات میں اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ان دونوں اعلانات نے مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچایا اور انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں میں ایک ایسا مضبوط ہتھیار فراہم کر دیا جسے وہ سالہا سال سے حاصل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی منتشر صفوں کو متحد و منظم کیا اور پھر مسلمانوں پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔

مسلم عوام کا قابلِ تعریف کردار

برصغیر کا مسلمان اپنی غیرت و حمیتِ دینی و ملی میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ وہ عالمِ اسلام کے ہر درد کو اپنا درد سمجھتا ہے اور اسلام و مسلمین کی عزت و حرمت پر مر مٹنے کے لئے ہمیشہ کمربستہ اور تیار رہتا ہے۔ اور یہی ہر مسلمان کی شان بھی ہونی چاہئے۔

جنگ طرابلس و بلقان ہو یا تحریک خلافت، حرمین شریفین پر سعودیوں کا تسلط ہو یا بیت المقدس پر یہودیوں کا غلبہ، تحریک تحفظ شریعت ہو یا تحریک بازیابی بابری مسجد،

جزیرۃ العرب میں امریکی و برطانی اتحادی فوجیوں کی آمد ہو یا عراق پر ان کا جارحانہ حملہ۔ ہر موقعہ پر اسلامیان ہند نے اپنی بے مثال غیرت وحمیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ساری دنیا چشم حیرت سے ان کا منہ دیکھتی رہ گئی ہے۔ اور ان کے مخلصانہ بے غرض جذبات و احساسات کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

بابری مسجد کے تحفظ کے لئے انہوں نے بارہ بنکی، میرٹھ، ملیانہ، ہاشم پورہ، بدایوں، بھاگل پور، کانپور، سورت، بمبئی، دہلی اور ملک کے ہر حصے میں جو قربانیاں دیں۔ زخم پر زخم کھائے۔ اپنی تجارت ومعیشت کو داؤ پر لگایا۔ اس کا اجر وثواب عظیم انہیں بارگاہ خداوندی میں ضرور ملے گا۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایثار وقربانی کا یہ عظیم الشان مظاہرہ صرف رضائے خدا ورسول کے لئے کیا ہے اور اس کے پیچھے ان کا کوئی دنیاوی مفاد پوشیدہ نہیں تھا۔

حکمراں اور سیکولر پارٹیوں کی سیاسی بازیگری

سیاست حاضرہ کی نیرنگی کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ وہ جس مسئلہ کو چاہے ابھار کر اس کے کاندھے پر سوار ہو جائے اور پوری قوم کو گرفتار بلا کردے اور اپنی شاطرانہ سیاست کو مذہب کا بادہ پہنا کر عوام کے دلوں کو لبھانے لگے۔

حکمراں اور سیکولر پارٹیوں نے مسئلہ بابری مسجد کی آڑ میں اپنی اپنی سیاسی دوکان چلائی ہے اور ہندوستانی عوام کو دل کھول کر بیوقوف بنایا ہے۔ کبھی کوئی بیان دے کر ہندوؤں کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی اور کبھی کوئی بیان دے کر مسلمانوں کو خوش کر دیا، لیکن عام طور پر ان سارے بیانات کے پس پردہ ان کی اپنی سیاست اور ووٹ بنک بنانے کی خواہش ضرور کارفرما رہی ہے۔ ان کی اس دورنگی حکمتِ عملی نے پورے ہندوستان کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اور ملک کے دستور وقانون اور تاریخ وروایت کو سرِ بازار رسوا کرنے میں ان کی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔

شہادتِ بابری مسجد کا تاریخی سانحہ

سپریم کورٹ اور ملک کے کروڑوں عوام کے سامنے بابری مسجد کے تحفظ کی یقین دہانی کے باوجود ۶ دسمبر ۹۲ء کو بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ سیکولر پارٹیاں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ حکمراں پارٹی طفل تسلیاں دیتی رہی۔ پانچ گھنٹے تک کارسیوک پوری آزادی کے ساتھ بابری مسجد پر ہتھوڑے برسا کر اس کے گنبد اور دیوار و در کو شہید کرتے رہے۔ پولیس اور فوج خاموش تماشائی بنی رہی۔ قانون وانتظام کی دھجیاں بکھرتی رہیں مگر ہندوستان کے کسی منسٹر کسی ایم پی اور کسی ایم ایل اے نے اس کے خلاف احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنا نمائشی استعفیٰ بھی نہیں پیش کیا!۔

اترپردیش میں صدر راج کے نفاذ کے بعد بھی تقریباً چھتیس گھنٹہ تک کارسیوک بابری مسجد کے ملبہ کی صفائی اور عارضی دیوار تعمیر کر کے اس کے اندر مورتی رکھنے کی کارروائی میں مصروف رہے۔ اور دنیا بھر میں ہندوستان کے سیکولرزم اور اس کی جمہوریت کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

اس موقع پر صرف بابری مسجد ہی شہید نہیں کی گئی بلکہ اجودھیا کی تقریباً تیس مساجد کو نقصان پہنچایا گیا۔ بہت سے قدیم تاریخی مزارات مسمار کر دئے گئے۔ سیکڑوں مسلم مکانات میں توڑ پھوڑ اور آتش زنی کی گئی اور بیسیوں مسلمانوں کو شہید کر ڈالا گیا۔

حکومتِ ہند نہ صرف بابری مسجد کے تحفظ میں ناکام رہی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کارسیوکوں کو یہ کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی کہ وہ اجودھیا سے ہر مسلم نشانی کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر ڈالیں۔ اور اس کی پاداش میں نہ کسی کو گرفتار کیا جائے گا اور نہ کسی کے خلاف کوئی مقدمہ چلایا جائے گا۔ بلکہ ان کا ہر خون معاف ہے۔

اکثریت واقلیت

اس کھلی ہوئی ناانصافی اور ظلم وستم کے پیچھے صرف ایک جذبہ کارفرما تھا کہ اکثریت

اپنی اجتماعی توانائی کے ساتھ اقلیت پر ایک بار زبردست حملہ کرکے اقلیت کو اتنا مجبور و بے بس بنادے اور انہیں اتنا کچل ڈالے کہ وہ یہاں پھر کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہ جائے۔ اور اسی کے ذریعہ ملک بھر کی اقلیت کو یہ پیغام دے دیا جائے کہ اگر اس نے دوسری جگہوں پر بھی زیادہ شور و ہنگامہ مچایا تو وہاں بھی ظلم و جبر کی یہی داستان دہرائی جائے گی اور اسے بچانے کے لئے کوئی حکومت ہمارے اوپر ہاتھ نہیں اٹھا سکتی۔

۶ر دسمبر کے بعد بھاجپا ریاستی حکومتیں گریں۔ انتہا پسند تنظیموں پر پابندی عائد کی گئی مگر اس کے باوجود ۶ر دسمبر سے پہلے جو کچھ ہو رہا تھا وہی حالات اب بھی ہیں۔ اور شرپسند عناصر تک انتظام و قانون کے ہاتھ پہنچنے میں تقریباً ہر جگہ ناکام و نامراد ہی نظر آرہے ہیں۔

آئین اور تاریخ کو چیلنج

انتہا پسند ہندو افراد کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ ہندوستان کے دستور اور اس کی تاریخ کو چیلنج کرنے میں بھی کوئی جھجک نہیں محسوس کر رہے ہیں۔ وہ ایک نئے دستور اور نئی تاریخ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کا مطالبہ یہ ہے کہ انصاف پسند مؤرخین نے ہندوستان کی صدیوں کی جو تاریخ مرتب کی ہے وہ حقائق پر مبنی نہیں۔ اور سیکولر بنیادوں پر ہندوستان کا جو آئین نافذ کیا گیا ہے اس کی بھی اب کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھوانا چاہتے ہیں کہ آریہ کہیں باہر سے نہیں آئے۔ محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، ہمایوں، بابر، اورنگ زیب وغیرہ غیر ملکی حملہ آور اور لٹیرے تھے۔ فلاں فلاں مسجدیں مندر توڑ کر بنائی گئی ہیں۔ راجہ داہر، پرتھوی راج، شیواجی وغیرہ ہمارے قومی ہیرو ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور آئین و دستور میں اقلیتوں کو جو تحفظات دئے گئے ہیں، ان کی عبادت گاہوں اور تعلیم گاہوں کو جو مراعات حاصل ہیں وہ ختم کردی جائیں۔ اور اکثریت کے مزاج اور اس کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کو سیکولر اسٹیٹ کی بجائے ہندو راشٹر بنادیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتہا پسندی اپنے نقطۂ عروج تک پہونچ چکی ہے اور اس کے

زوال کا وقت اب قریب آچکا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خود اپنے انجام کو پہونچ جائے گی۔

خدا اعتمادی و خود اعتمادی

مسلمانانِ ہند کو چاہیئے کہ وہ موجودہ نازک حالات سے قطعاً خائف اور مایوس نہ ہوں۔ خدائے وحدہ لاشریک کی قدرت و کارسازی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کرنا سیکھیں۔ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے صرف حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی طرف نہ دیکھیں بلکہ اپنے مسائل کا حل اپنے اندر تلاش کریں۔ جذباتی مسائل کے تیز دھارے کے ساتھ اپنے تعلیمی، تجارتی اور اقتصادی حالات اور ان کی درستگی کی طرف خاطر خواہ توجہ دیں۔ اور خود اپنے اندر اتنی صلاحیت و طاقت پیدا کریں اور اپنی اہمیت کو اس طرح اجاگر کریں کہ پورا ملک آپ کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرنے لگے اور آپ اکثریت کی نظر میں بھی ملک کا گراں قدر اثاثہ اور قابلِ قدر سرمایہ بن جائیں۔

فراستِ مومنانہ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اس نازک اور بحرانی دَور کو بڑھ کر خود اپنے قابو میں کرلیں۔ اور پورے ملک میں انتشار و انارکی کی جو کیفیت پیدا ہوچکی ہے۔ اس کے پیش نظر اپنے تدبر اور حکمت عملی کی صلاحیت کو بروئے کار لائیں۔ اور اس خاکستر سے ایک جہانِ نو پیدا کر کے اپنے روشن مستقبل کی تعمیر کریں۔

یٰسٓ اختر مصباحی
نئی دہلی

دوشنبہ ۱۰ رجب ۱۴۱۳ھ
۴ جنوری ۱۹۹۳ء

بابری مسجد اور دیگر مقبوضہ مساجد کی واگزاری کا مطالبہ

مسجد خدا کا گھر ہے۔ اللہ کی عبادت و ریاضت کی جگہ ہے۔ مسلمانوں کا سب سے مبارک و مقدس مقام ہے اور زمین کا ایسا قابلِ احترام حصہ ہے جہاں خالقِ کائنات کی توحید و ربوبیت کا شب و روز اقرار و اعتراف اور اظہار و اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کی حمد و ثنا کی جاتی ہے اور اس کے ذکر و فکر اور اس کی تسبیح و تہلیل سے مسجد کی فضائیں ہمیشہ گونجتی رہتی ہیں۔

خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کے سامنے سر بسجود ہونے کے لئے سب سے پہلا گھر جو تعمیر ہوا وہ کعبۂ مقدسہ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح ہے۔

"سب سے پہلے جو مکان انسانوں کی عبادت کے لئے مقرر ہوا وہ مکہ میں ہے جس میں خیر و برکت ہے اور جو سارے اہل جہاں کا مرکز ہدایت ہے۔"

(ترجمہ سورۂ آل عمران آیت ۹۶)

جو مساجد عالمِ وجود میں آگئیں ان کے بارے میں سارے مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ قیامت تک کے لئے اسے قائم و دائم رکھنا ضروری ہے۔ اور اسے کسی بھی طرح دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ مسجد کی زمین کے نیچے اور چھت کے اوپر کا سارا حصہ داخلِ مسجد ہے۔ اس کی تخریب و انہدام اور توہین و بے حرمتی کا ارتکاب وہی بدقسمت انسان کر سکتا ہے جو ایمان و اسلام کی برکتوں سے محروم اور کفر و شرک کی غلاظتوں میں ملوث ہو۔

اہلِ ایمان ان مساجد کی تعمیر و آبادکاری میں حصہ لیتے ہیں اور کفار و مشرکین انہیں ویران اور غیر آباد کرنے کی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ رب کائنات ارشاد فرماتا ہے: "مشرکین کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جس حالت میں کہ وہ اپنے اوپر خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور انہیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈریں" (ترجمہ سورۂ توبہ آیت ۱۷-۱۸)

اللہ کی عبادت سے روکنے والے اور اس کی مسجدوں کو تباہ و برباد کرنے والے انسان خدا کے باغی اور سرکش و ظالم ہیں "اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے؟ اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟" (ترجمہ سورۂ بقرہ آیت ۱۱۴)

مسلمانانِ ہند کے دلوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ سیشن جج فیض آباد یوپی نے بابری مسجد اجودھیا کے لئے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو یہ فیصلہ دیا کہ اس کا تالا توڑ کر پوجا کی جا سکتی ہے۔ جس پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔ مسجد کو بت کدہ قرار دینا ہندوستان کی سیکولر تاریخ کا ایک سیاہ باب اور اس کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ ظلم و ستم کی ایک نئی روایت ہے اور افرادی طاقت و قوت کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کی بدترین مثال ہے۔ جس سے تخریب کارانہ ذہنیتوں کو ہوا ملے گی اور فرقہ پرست جماعتیں کھُل کر اپنا کھیل کھیلنے لگیں گی۔

ایک منظم سازش کے تحت اس وقت مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل میں الجھا کر ان کے شیرازہ کو منتشر اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ بھارت کا نیشنل پریس ان کے خلاف زہر افشانیاں کر رہا ہے۔ اسلام کے اصول و قوانین اور اس کی مقدس شخصیتوں کے سلسلے میں بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ مسلم پرسنل لا کو سبوتاژ کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ شعائرِ دین کی پامالی کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ قرآن حکیم پر حملے ہو رہے ہیں اور بہت ساری مساجد میں انہیں نماز پڑھنے سے روکا جا رہا ہے۔ جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ مسلمان مجبور ہو کر اپنے امتیاز و تشخص کو خیرباد کہہ دیں اور اپنے آپ کو

گنگا وجمنا کے دھاروں کے حوالہ کردیں۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنے دین و ایمان کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہیں اور انہیں کوئی بھی طاقت کسی قیمت پر سرحدِ اسلام سے باہر نہیں نکال سکتی اور ہر موڑ پر انہوں نے اپنے استقلال و استقامت کا زبردست مظاہرہ اور اسلام دشمن قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا ہے۔ یہی وہ جذبۂ ایمانی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور ہزار مزاحمتوں کے باوجود اپنے دین و مذہب اور تہذیب و تمدن کی باوقار حفاظت و پاسبانی میں مصروف ہیں۔

بابری مسجد اجودھیا کے تنازعہ کے پس منظر میں جو بات سب سے زیادہ قابلِ تعریف رہی ہے وہ ہے مسلمانوں کا صبر اور نظم و ضبط! گزشتہ ۳۵ سال سے مسلمانوں نے جس طرح اس معاملے میں اپنی جرأت و ہمت اور ثبات قدمی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی اس اسلامی تعلیم کا نتیجہ ہے جو انہیں حالات کا باوقار انداز میں صبر و ضبط سے مقابلہ کرنے کا درس دیتی ہے۔

بابری مسجد کے تالا توڑنے اور اس میں پوجا کرنے کی جس طرح اجازت دی گئی ہے اس سے مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ اور ان کا یہ خیال اب یقین کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ انہیں بھارت دیش میں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جا رہا ہے۔

لیکن خائف و ہراساں اور مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے سامنے آئینی اور قانونی جد و جہد کے سارے راستے کھلے ہیں۔ یہ فیصلہ یقیناً عدالتِ بالا میں چیلنج کیا جائے گا اور فوری طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ اس مسئلے کو عدالت بالا میں اٹھائے جانے کا اہتمام کیا جائے۔ ملک کے ممتاز مسلم ماہرینِ قانون عملی طور پر اس کے لئے متحرک ہو جائیں اور تدبر و دانش مندی کے ساتھ اسے آگے بڑھائیں۔

حکومتِ ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور ان کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے بابری مسجد اجودھیا کو ان کے حوالہ کیا جائے اور اس میں انہیں نماز ادا کرنے کی باضابطہ اجازت دی جائے۔

اسی طرح دہلی، ہریانہ، راجستھان، پنجاب وغیرہ کی جو مساجد غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں انہیں مسلمانوں کے حوالہ کرے اور محکمۂ آثار قدیمہ کی ساری مساجد کے دروازے پنج وقتہ نماز باجماعت کے لئے کھول دے۔ (از یٰسین اختر مصباحی ص ۱۰۔ ہفت روزہ اخبار نو دہلی۔ ۱۴ ر تا ۲۰ ر فروری ۱۹۸۶ء)

تقریبات ۲۶/ جنوری کا بائیکاٹ!

ایک عجلت پسندانہ فیصلہ

بابری مسجد کا نازک اور اہم مسئلہ سارے مسلمانانِ ہند اور جمہوریت پسند برادرانِ وطن کے لئے سنجیدہ غور و فکر کا موضوع اور دُور رس اثرات و نتائج کا حامل ایک ایسا سوالیہ نشان بن چکا ہے جس سے صرفِ نظر کرنا انصاف و دیانت ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کی دیرینہ روایات کا مذاق، اس کے دستور و آئین کی توہین اور اس کی جمہوریت کا کھلا ہوا قتل ہے۔

لیکن اس صبر آزما اور تاریخی جنگ میں ملتِ اسلامیہ ہند کو اپنی جرأتِ رندانہ کے ساتھ ہی اپنی فراستِ مومنانہ سے بھی کام لینا ہوگا، پورے صبر و استقامت کے ساتھ یہ فکری و تاریخی جنگ لڑنی ہوگی اور منزلِ انصاف تک پہونچنے کے لئے پہلے ہی مرحلے میں اسے کوئی ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہئے جو اسے اپنی منزل سے دُور کر کے غلط راہوں پر ڈال دے اور نئی نئی مشکلات و مسائل کا شکار بنا دے۔ بابری مسجد کانفرنس نے یومِ جمہوریہ ہند کو یومِ غم منانے کا مسلمانوں سے جس طرح مطالبہ کیا ہے وہ ایک نہایت عجلت پسندانہ اقدام ہے جس پر مسلم جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے نظرِ ثانی کا جوابی مطالبہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ قائدین و اکابرینِ تحریک اگر اپنے فیصلے پر اٹل رہیں، جب بھی انہیں چاہیے کہ سرکاری ملازمین کی طرح عام مسلمانوں کو بھی وہ مستثنیٰ قرار دے کر خود ہی میدان میں جمے رہیں اور دہلی کی کسی مرکزی جگہ پر مشترکہ طور پر یومِ جمہوریہ کے موقع پر جمہوری انداز سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں۔

دانش مندی و دُور اندیشی کا تقاضہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ حکومتِ ہند کے ساتھ گفت و شنید ہی کے ذریعہ حل کیا جائے تاکہ ساتھ ہی ساتھ اس خطرے کا بھی مقابلہ کیا جا سکے جو یونیفارم سول کوڈ کے نام سے ہمارے سروں پہ منڈلانے لگا ہے۔ اور بہتر ہے کہ اجودھیا اور فیض آباد کے ان مسلمانوں سے حکومتِ ہند گفتگو کر کے مسائل کا تصفیہ کرے جو تیس پینتیس سال سے بابری مسجد کا مقدمہ لڑ رہے ہیں اور اس کے سارے حالات و معاملات سے اچھی طرح واقف ہیں۔

(از رئیس اختر مصباحی - ص-۱- ہفت روزہ اخبار نو دہلی - ۱۶ تا ۲۲ جنوری ۱۹۸۷ء)

گجرات، میرٹھ اور دہلی کے فسادات

گجرات، میرٹھ اور دہلی کے حالیہ فسادات میں پولیس اور پی اے سی نے اپنے ظلم و بربریت کا جو شرمناک مظاہرہ کیا ہے اور انسانیت کا جس طرح قتل عام کیا ہے اسے ہندوستان کی جمہوری تاریخ کبھی معاف نہیں کرسکتی۔

ظالم پی اے سی نے میرٹھ میں (بتاریخ ۲۲، ۲۳ مئی ۱۹۸۷ء) انسانی خون کی جس طرح ندیاں بہائی ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ اس کے تعصب اور سنگدلی کا جو بھیانک روپ سامنے آیا ہے وہ سیکولر ہندوستان کی تاریخ کا ایک بدنما داغ اور اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔

اس لئے حکومتِ ہند سے ہماری گزارش ہے کہ

(۱) پی اے سی کو بالکل ختم کردیا جائے یا اس کی اس طرح تشکیلِ نو کی جائے کہ اس میں مسلمانوں کا تناسب کم از کم چالیس فیصد ہو۔ اور ہندو مسلم فساد سے متاثرہ علاقے میں جو پولیس بھیجی جائے اس میں کم از کم پچیس فیصد مسلم پولیس کی شرکت ضروری قرار دی جائے۔

(۲) گجرات، میرٹھ اور دہلی کے فسادات میں پولیس، پی اے سی اور فرقہ پرست تنظیموں کی زیادتیوں کے خلاف عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور عدالتی بنچ کی رپورٹ اور اس کی تجاویز پر فوری عمل درآمد کا انتظام کیا جائے۔

(۳) متاثرہ افراد اور مظلوموں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ فسادیوں اور بلوائیوں کے خلاف کسی خوف وخطرہ کے بغیر قانونی چارہ جوئی کرسکیں۔

(۴) نفرت واشتعال پھیلانے والے سیاسی لیڈروں، سرکاری افسروں اور

لوٹ مار میں ملوث پولیس و پی اے سی کے خلاف شکایات ملتے ہی ان پر مقدمات چلائے جائیں اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ ضلع حکام خصوصاً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس ایس پی کے رول اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

(۵) مہلوکین کے اہلِ خانہ کو دو دو لاکھ اور زخمیوں کے علاج کے لئے بیس بیس ہزار روپے کی مالی امداد دی جائے۔ نیز جن لوگوں کے مکانات و کارخانے اور دوکانیں تباہ ہوئی ہیں انہیں مناسب معاوضہ دے کر بازآبادکاری کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۶) مسلمانوں کی یک طرفہ گرفتاری، ان کے خلاف بیجا مقدمات، ان کے گھروں کی وحشیانہ تلاشی اور فرقہ پرست فسادیوں کو کرفیو میں بھی کھلی چھوٹ یا ڈھیل کے ذریعہ ان کی پشت پناہی کر کے ہندوستان کی وحدت و سالمیت کی جڑیں کھودنے اور اس کے دستور و آئین کی برسرِعام توہین کرنے کا خطرناک کھیل بند کیا جائے۔

(۷) قومی و ملکی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے سرکاری سطح پر ایسے بیانات و اقدامات سے سخت پرہیز کیا جائے جن سے اندرونی امن و سلامتی کو خطرہ لاحق ہو اور مختلف قوموں کے درمیان نفرت و عداوت بڑھنے اور پھیلنے کا اندیشہ ہو۔

(۸) ہندو مسلم فساد کے نازک موقع پر بیرونی ہاتھ کا بے بنیاد اور شر پسندانہ بہانہ کرنے کی بجائے اندرونی ہاتھ تلاش کئے جائیں اور انہیں مظلوموں پر ستم ڈھانے سے پہلے ہی پکڑ کر کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے۔

(۹) مستقل امن و امان قائم رکھنے کے لئے ملک کے ہر شہری کے دستوری و آئینی حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اس کی عبادت گاہ اور مذہبی و تہذیبی تشخص و انفرادیت کے ساتھ کسی طرح کا ناروا سلوک اور بیجا مداخلت نہ کی جائے۔ بالخصوص مسلمانوں کی مساجد اور ان کے پرسنل لاء کے ساتھ جاہلانہ و متعصبانہ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ فوراً بند کیا جائے۔

(۱۰) امن پسند شہریوں اور وطن دوست قائدین و زعماء کی باہمی گفتگو کا حکومتی سطح پر جلد از جلد انتظام کیا جائے تاکہ برادرانِ وطن کے درمیان پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ممکن حد تک ازالہ ہو سکے اور متنازعہ مسائل کے حل کی جانب مثبت پیش قدمی کے امکانات روشن ہو سکیں۔ ۲-۶-۱۹۸۷ء

(از یٰسین اختر مصباحی - ص ۶۹ - ماہنامہ قاری دہلی - جولائی ۱۹۸۷ء)

تحریک خلافت سے
تحریک بابری مسجد تک

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سرپرستی اور حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی و مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں چلنے والی تحریک خلافت متحدہ ہندوستان کی ایسی ہنگامہ خیز عوامی تحریک تھی جس نے کشمیر سے کنیاکماری تک اور ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ سقوط سلطنت مغلیہ کے بعد پہلی بار اس تحریک نے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا شعور بخشا اور خلافت کے نام پر مرمٹنے کا ارمان ان کے سینوں میں انگڑائیاں لینے لگا۔

لیکن ۱۹۱۹ء میں چلائی گئی یہ تحریک محض جذبات کی بنیاد پر اٹھی تھی اور اس کی کوئی فکری اساس و بنیاد نہ تھی۔ اس لئے دو تین سالوں کے اندر اندر اسے عبرت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور ۱۹۲۲ء میں اس تحریک کی کمر اس وقت اور ٹوٹ گئی جب مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اعلان کر کے زمام اختیار و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بلکہ اس سے پہلے ہی بڑی ذہانت و منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گاندھی و دیگر لیڈروں نے اسے تحریک ترک موالات (نان کوآپریشن مومنٹ) میں تبدیل کر کے اس کی ہیئت ترکیبی ہی کے اندر سیاسی آمیزش کر ڈالی تھی اور ایک دینی تحریک کو سیاسی تحریک کا رنگ دے دیا تھا۔

حضرت مولانا احمد رضا فاضل بریلوی، حضرت مفتی مظہر اللہ دہلوی اور حضرت مولانا سید سلیمان اشرف وغیرہم نے لاکھ سمجھایا کہ یہ خلافت شرعی خلافت نہیں ہے اور اپنی

ناتوانی و بے سروسامانی کے سبب ہم ترکی یا عرب جاکر خلافت قائم کرنے کے شرعاً مکلف نہیں رہ گئی بات ترکوں کی مدد کی، تو صرف ترک ہی کیا بلکہ دنیا کے ہر مسلمان کی ممکن امداد و عنایت دنیا کے ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس لئے جو کام اپنی استطاعت کے اندر ہے صرف اسی کو انجام دیا جانا چاہئے۔ اور ساری قوم کو جذبات کے سیلاب میں بہا کر چند در چند مشکلات و مصائب کا شکار بنا دینا خیر خواہی اسلام و مسلمین کے بالکل خلاف ہے۔ مگر قائدین تحریک خلافت اور اکثر مسلمانوں نے اس وقت ان کی بات نہیں سنی اور قومی لیڈروں کے شور و غوغا میں ان کی آواز دب کر رہ گئی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی بھی اسی فکر و خیال کے حامی تھے اس لئے ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "یہ جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان اور قلم پر قابو رہا ہے۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے اور حبیب الرحمٰن، سے حبیب الشیطٰن" مشہور ہوئے"

(معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء)

یہاں تک کہ عام علماء دیوبند کی رائے کے برعکس جب مولانا اشرف علی تھانوی نے تحریک خلافت سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا تو انہیں اس مسئلہ پر خود اپنے ہی حلقے میں معتوب ہونا پڑا اور انگریزوں کے لئے نرم گوشہ رکھنے کا الزام اپنے سر لینا پڑا۔ جیسا کہ پروفیسر محمد سرور رقم طراز ہیں۔ "مولانا (عبیداللہ) سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی کے علم و فضل اور ارشاد و سلوک میں انہیں جو بلند مقام حاصل ہے اس کے تو قائل تھے، لیکن تحریک آزادی ہند کے بارے میں ان کی جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں جو مؤیدانہ مستقل روش رہی اس سے وہ سخت خفا تھے"

(ص ۳۸۲۔ افادات و ملفوظات مولانا سندھی۔ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور)

لیکن حقائق بہرحال حقائق ہوتے ہیں اور کسی بھی حقیقت کو بے بنیاد افسانوں اور الزام تراشیوں کے ذریعہ دبایا نہیں جاسکتا ہے جا تعصب و عناد کا سینہ چیر کر جب اس کا آفتاب دلوں کے آفاق پر چمکنے لگتا ہے تو ہر سلیم الفطرت انسان اس کے

درخشاں وجود کا قائل ہو جاتا ہے اور اس کی بصارت و بصیرت کا گوشہ گوشہ روشن و منور ہو جاتا ہے۔

بڑے ہی طمطراق کے ساتھ اٹھائی گئی اس تحریک خلافت کی عبرت ناک اصولی ناکامی نے چشم زدن میں جذباتی مسلم قیادت کا ہوائی قلعہ مسمار کر دیا اور ایک طویل عرصے تک ایسی خاموشی چھائی رہی کہ ؎

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

اس حادثہ کے بعد اس دور کے ایک نوجوان عالم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مسلم قیادت سے اس حد تک اعتماد اٹھ گیا کہ ان کا انداز فکر ہی بالکل بدل گیا اور رفتہ رفتہ وہ اس منزل تک پہنچے کہ "جماعت اسلامی" کے نام سے انہوں نے اپنی ایک الگ جماعت ہی بنا ڈالی۔

تقریباً بیس سال کے بعد مسلم جذبات کا دوسرا طوفان اس وقت اٹھا جب سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اندر قرارداد پاکستان پاس ہوئی اور انتخابی نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے مطابق مسلمانوں کی اکثریت نے کھل کر اس تحریک پاکستان کی حمایت کی جس کی قیادت کی باگ ڈور مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی۔ بہت سے علماء کرام و مشائخ ملت اور مسلم دانش وروں کا دل و دماغ بھی تحریک پاکستان کی پشت پناہی میں لگ گیا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں یہ تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی جس کے نتیجہ میں ۱۴ اگست کو پاکستان کے نام سے ایک الگ مسلم ریاست دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آئی۔

حضرت مولانا سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی، مولانا سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا مصطفیٰ رضا قادری بریلوی کی سرپرستی میں آل انڈیا سنی کانفرنس نے سنہ ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان کو اس وقت نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا جب بنارس میں اپنی کل ہند کانفرنس کے اندر مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مولانا سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، مولانا

سید ابن الحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا مفتی برہان الحق جبل پوری، مولانا عبدالغفور ہزاروی اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش وغیرہم نے اجتماعی طور پر اس کے حق میں تجاویز پاس کر کے اپنی متحدہ حمایت و اعانت کا اظہار و اعلان کر دیا اور اپنے چھوٹے بڑے جلسوں کی تجاویز کو منظم شکل دے دی۔

البتہ بعض علماء اہل سنت مثلاً مولانا سید اولاد رسول محمد میاں برکاتی مارہروی و مولانا حشمت علی لکھنوی وغیرہما پوری شدت کے ساتھ اس تحریک پاکستان کے مخالف بھی رہے ہیں اور کانگریس و مسلم لیگ دونوں سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد چوں کہ آل انڈیا سنی کانفرنس کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے علامہ سید احمد سعید کاظمی کی تحریک پر مارچ ۱۹۴۸ء میں ملتان کے اندر پاکستان بھر کے علماء و مشائخ اہل سنت کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں جمعیۃ العلماء پاکستان کی تشکیل ہوئی اور ابوالحسنات، مولانا محمد احمد قادری بن مولانا سید دیدار علی محدث الوری اور علامہ سید احمد سعید کاظمی بالترتیب اس کے پہلے صدر و ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور آج کل اس کے صدر ہیں مولانا شاہ احمد نورانی بن مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی۔ اور ناظم اعلیٰ ہیں مولانا عبدالستار خاں نیازی۔

دوسری جانب مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد ٹانڈوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم کی جماعت تھی جو جمعیۃ العلماء ہند کے پلیٹ فارم سے کانگریس کی حامی و ہمنوا اور تحریک پاکستان کی شدید مخالف تھی۔ کانگریسی مسلم لیڈروں کی قیادت مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت کے مسلمانوں کی اکثریت نے انہیں نظر انداز کر کے متحدہ قومیت و متحدہ ہندوستان کا نظریہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پھر وہ سب کچھ ہوا جس کے ذکر و اعادہ کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت! البتہ یہاں اس پہلو کی نشاندہی ضروری ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی و مولانا ظفر احمد تھانوی نے جمعیۃ العلماء ہند سے اختلاف کر کے تحریک پاکستان کا آخر وقت میں کھل کر ساتھ دیا اور اس جمعیۃ العلماء اسلام کے قائدین میں شامل ہو گئے جو مسلم لیگ کی حامی

وابستہ تھی۔ یہ جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان میں اب بھی زندہ ہے اور مفتی محمود و مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہما اس کے مشہور زعیم و قائد رہ چکے ہیں۔

ان کے برعکس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی جماعت کے ساتھ کانگریس و مسلم لیگ دونوں سے اختلاف رکھتے تھے اور تحریک پاکستان کے بھی زبردست مخالف تھے۔

تقسیم ہند کا عمل کتنا صحیح اور کتنا غلط تھا، اس پر اب بحث کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں اس کی تائید یا مخالفت کرنے والوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں جن کی صدائے بازگشت اب بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے۔ لیکن اس بات پر بہت سے حامیوں و مخالفوں کا تقریباً اتفاق ہے کہ تحریک خلافت کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے عالمی وقار میں اضافہ ہوا اور ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار انہوں نے انگڑائی لی جس کو مزید گہرائی و گیرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہی تحریک خلافت دراصل ایک دوسری شکل میں تحریک پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور یہ انگڑائی ایک لمبی جست میں تبدیل ہوگئی۔

لیکن تاریخ کا یہ المناک باب ہمیں بتاتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد پنجاب، سندھ، کشمیر، دہلی اور بنگال و بہار کے خونیں فسادات کے سیلاب میں لاکھوں انسان خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ خاندان کے خاندان اُجڑ گئے اور پوری پوری آبادیاں تباہ و برباد اور ویران و سنسان ہوگئیں۔ ہزاروں انسانوں نے انسانیت کا لبادہ اتار پھینکا اور ہر چہار جانب حیوانیت محو رقص نظر آنے لگی۔ بہت دنوں کے بعد ہوش آیا تو لٹتے ہوئے انسانی کارواں کی طرف ان کی نگاہ توجہ اٹھی اور پھر ندامت و شرمندگی کے ساتھ انہوں نے دوبارہ انسانی جامہ زیب تن کرکے اپنی انسانیت کو نئی زندگی بخشی۔

بہرحال! اس تقسیم کا خمیازہ ہندوستانی مسلمانوں کو سب سے زیادہ بھگتنا پڑا اور ان کی حالت پورے ملک میں قابلِ رحم ہوگئی۔ زندگی کے ہر شعبے میں انہیں منظم منصوبہ کے تحت بہت پیچھے ڈھکیل دیا گیا اور فرقہ پرست افراد اور تنظیموں کے طعن و تشنیع اور تعصب و عناد کا انہیں قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔ عملی طور پر انہیں بھارت کے دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا گیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور چالیس سال کا طویل

عرصہ گزر جانے کے باوجود اس متعصب و فرقہ پرست طبقے کی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہ ہو سکی جو مزید انتقامی کارروائی کے طور پر "ہندو راشٹر" کے نعرے لگا رہا ہے اور مسلمانوں کو اس ملک سے باہر ڈھکیلنے یا ہر شعبۂ زندگی سے بے دخل کر کے انہیں بے دست و پا بنا دینے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مذکورہ تحریک خلافت و تحریک پاکستان کے بعد سب سے زیادہ عوامی اور ہمہ گیر تحریک مقدمہ شاہ بانو میں فیصلہ سپریم کورٹ (۲۳ر اپریل ۸۵ء) کے بعد چلی جسے تحریک تحفظ شریعت کا نام دیا گیا اور پارلیمنٹ میں پاس کئے گئے ایک بل کے ذریعہ ضمنی کامیابی حاصل ہوتے کے بعد ہی ملت اسلامیہ ہند کے جذبات کا طوفان رکا۔ لیکن بڑی دیدہ دلیری اور منصوبہ بندی کے ساتھ ایک مقامی کورٹ کے فیصلے کو آڑ بنا کر بابری مسجد اجودھیا کے دروازے کا تالا کھول کر (یکم فروری ۸۶ء) اصل مسئلے کو بری طرح الجھانے کے علاوہ اسے سازشی اذہان نے "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کے دلدل میں پھنسا دیا۔

ایسے نازک حالات میں مخلص و اعتدال پسند علماء و قائدین کا فرض ہے کہ وہ ماضی کی تحریکات اور ان کے نتائج کو سامنے رکھ کر اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب و وجوہ کا جائزہ لیں اور اپنے مسائل کی باگ ڈور سیاسی بازیگروں کے ہاتھ میں دینے کی ایسی غلطی اور ایسے جرم کا ارتکاب نہ کریں جس کا انجام ذلت آمیز اور تباہ کن ثابت ہو سکے۔

تقسیم ہند کے بعد ملک کی جو زہر آلود فضا بنی تھی اسی قسم کی فضا بنانے کی آج بھی درپردہ سازش کی جا رہی ہے اور تحریک تحفظ شریعت جس کا رخ حکومت وقت کی جانب تھا اسے حکمت عملی کے ذریعہ تحریک تحفظ بابری مسجد کی طرف دانستہ طور پر پھیر دیا گیا اور مسلم عوام کو براہ راست ہندو عوام کے آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا تاکہ مسلسل تصادم کے ذریعہ مسلمانوں کو مسلسل سبق سکھایا جاتا رہے اور تعمیری کاموں سے روک کر دفاع، احتجاج مظاہرہ اور نعرہ بازی کی راہ پر انہیں چلایا جاتا رہے۔

گزشتہ تحریکات کے جس طرح دوررس اثرات و نتائج برآمد ہوئے اسی طرح اس تحریک تحفظ بابری مسجد کے بھی نہایت دوررس اثرات و نتائج سامنے آئیں گے کیوں کہ

یہ صرف ایک عمارت اور زمین کی نہیں بلکہ ایک مستقل فکر اور صدیوں پر محیط ایک مستقل تاریخ کی جنگ ہے جو اپنی اصل اور بنیاد کے اعتبار سے برسوں نہیں بلکہ شاید صدیوں تک جاری رہے۔ اس لئے اتنی طویل جنگ اسمبلی و پارلیمنٹ کی کرسی اور وقتی و عارضی شہرت و ناموری کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ اخلاص و دردمندی اور عزیمت و استقامت کے ساتھ انصاف و قانون کی عدالت ہی میں لڑی جاسکتی ہے اور مسلم عوام سے صرف وہی قربانی طلب کی جاسکتی ہے جس کے وہ مکلف ہیں۔

اس سے الگ ہٹ کر صرف شور و غوغا اور جذباتی ہنگامہ آرائیوں کی بیساکھیاں استعمال کی جاتی رہیں تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ عہدِ حاضر کا مؤرخ تحریک تحفظ بابری مسجد کو تحریک تحفظ خلافت سے زیادہ جذباتی اور اسی کی طرح ناکام تحریک قرار دے، بلکہ اس تحریک کے سر یہ الزام بھی عائد کر دے کہ اس کی غلط روی نے ملتِ اسلامیہ ہند کو چند در چند مسائل و مشکلات سے دوچار کر دیا اور اس کے تلخ ترین نتائج نے مسلم عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

مسلمانوں کے تعمیری، تعلیمی، اقتصادی، تجارتی اور معاشرتی مسائل سے آنکھیں بند کر کے یا عارضی فوائد کی لالچ میں ان کے ساتھ بے توجہی کا سلوک کر کے کسی مفید اور پائدار نتیجہ تک ہرگز نہیں پہنچا جاسکتا۔ نہ ہی جذبات کی بنیاد پر تعمیر شدہ عمارتوں کو زیادہ دنوں تک آفات و حوادثِ روزگار کی زد سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے پیدا کردہ مسائل کی خارزار وادی میں اپنا دامن الجھانے کو بھی دانشمندی و دور اندیشی کی کوئی صحت مند اور اچھی علامت نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ ہند کے وسیع تر مفادات و مصالح کو سامنے رکھ کر ہی ہر قدم اٹھایا جائے اور جو مسئلہ جتنی اہمیت کا حامل اور جتنی توجہ کا طالب ہو اسے اسی کے دائرے میں رکھ کر دیکھا اور سوچا جائے۔ امارت و قیادت اور اصلاح و جہاد کے نمائشی نعروں کا استعمال اور مسلم جذبات کا استحصال کرتے رہنے کی روش کو چھوڑ دیا جائے اور ان تدابیر کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے جن میں ملتِ اسلامیہ ہند کے

اجتماعی مفاد اور اس کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

اور اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ بارہ بنکی، میرٹھ، مظفر نگر اور فیض آباد وغیرہ کے مسلم شہداء کے خون کا بھی ہمیں بروز قیامت حساب دینا ہے اور اس حاکم حقیقی کی عدالت میں پیش ہونا ہے جو دلوں کے راز اور پوشیدہ عزائم سے اچھی طرح واقف ہے کہ کون سا کام کس نیت سے کیا جارہا ہے، کس کا قدم مسجد کی طرف اٹھ رہا ہے اور کس کی لپک سیاست وصحافت کی رنگینیوں اور حاکمان وقت کی خوشنودیوں اور کاسہ لیسیوں کی طرف ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اخلاص وبصیرت سے نوازے اور نفاق وجہالت سے ہمیشہ دور رکھے۔ آمین

بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

(از یٰس اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۸ء)

تحریک بابری مسجد
اور
نیشنل پریس (۶۸۸)

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کے ساتھ جو مسلسل ناانصافیاں ہوتی چلی آئی ہیں ان کا ایک نمونہ بابری مسجد کی وہ عمارت ہے جس کے اندر سنہ ۱۹۴۹ء میں راتوں رات ایک بت رکھ کر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا اور مسلمانوں کی ہزار کوششوں اور مزاحمتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ وہ بت اپنی جگہ باقی رکھا گیا بلکہ بابری مسجد کے دو سو گز کے آس پاس کسی مسلمان کو جانے سے بھی روک دیا گیا اور مسلمانوں کے دائر کردہ مقدمات کو سرد خانے میں ڈال کر ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرزم کا اب تک مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

سنہ ۱۹۸۶ء میں ایک سرسری سماعت کے بعد فیض آباد کی مقامی عدالت نے اس کا تالا کھولنے کی اجازت دے کر اور پھر حکومتِ ہند کے ذرائع ابلاغ نے اس میں ہندوؤں کے داخلہ کو ٹی وی پر دکھا کر اور اس کی تشہیر کر کے مسلمانوں کے زخم پر نمک چھڑکنے کا جو غیر منصفانہ کردار ادا کیا ہے وہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔

اور اس سلسلے میں مسلمانانِ ہند نے جس طرح اپنے احتجاجی جذبات کا مظاہرہ کیا اور بوٹ کلب (دہلی) پر جمع ہو کر حکومتِ ہند کو جس منظم اور پُرامن انداز میں متوجہ کیا اس کا تاریخی منظر بھی ہماری نگاہوں کے سامنے گردش کر رہا ہے۔ اور ہم اسے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و قومی اور اجتماعی بیداری کا نقطۂ عروج سمجھتے ہوئے ان کے اسلامی جذبات و احساسات کے اس بامقصد مظاہرہ کو پُرخلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ساتھ ہی قائدین تحریک بابری مسجد سے یہ مخلصانہ و ہمدردانہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جلد بازی یا ان میں سے بعض حضرات نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا استحصال کر کے انہیں بے حد نقصان پہنچایا اور بہت سے تعمیری میدانوں میں انہیں چند در چند مشکلات کا شکار کر کے پس ماندگی اور برادرانِ وطن کی شدید نفرت کے الاؤ کی طرف ڈھکیلنے کا ناخوش گوار فریضہ انجام دے کر وہ فرقہ پرست اور تخریبی عناصر کی سازشوں کا آلہ کار بن گئے۔

ایسے نازک حالات میں کل ہند مسلم پرسنل لاء کانفرنس کے صدر حضرت مولانا ارشد القادری اور راقم سطور نے تقریبات ۲۶ر جنوری کے بائیکاٹ اور اجودھیا مارچ سے اپنے اصولی اختلاف کا اظہار اخبارات و رسائل کے ذریعہ کر دیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ پیش آنے والے حالات و واقعات نے ہمارے افکار و خیالات کی واضح تائید و توثیق بھی کر دی۔

اس لئے مذکورہ امور کی جانب توجہ دلاتے ہوئے موجودہ قائدینِ تحریک سے ہم عرض گزار ہیں کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے مستقبل کی جانب اب کوئی قدم اٹھایا جائے۔ اور ایثار و خلوص کے ساتھ بابری مسجد کے حصول کی اصولی اور قانونی کوششوں کو بروئے کار لا کر حکومت وقت سے اپنے مطالبات منوائے جائیں اور ہر اس اقدام سے پرہیز کیا جائے جس سے برادرانِ وطن کے ساتھ غیر ضروری تصادم کا خطرہ پیش آسکے۔

نومبر ۱۹۸۸ء میں تحریک کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد جو صورت پیدا ہوئی ہے وہ نہایت افسوسناک ہے۔ کیوں کہ اب بازیابیٔ بابری مسجد کی جگہ قیادت و اقتدار کی طرف کچھ لوگوں کی توجہ مبذول ہو گئی ہے۔ بہر حال! ذیل میں تین انگریزی اخبارات کے ادارئیے دئے جا رہے ہیں تاکہ اس مسئلہ پر نیشنل پریس کے سوچنے کا انداز قارئین کے سامنے آسکے۔

(یٰسٓ اختر مصباحی)

نیشنل پریس کی رائے

ا۔ گزشتہ سنیچر کی میٹنگ میں جسے بابری مسجد ایکشن کمیٹی سے منحرف گروپ نے بلایا

تھا۔ معترضین نے کمیٹی کے طریقہ کار پر تنقید کرتے ہوئے گرچہ سید شہاب الدین کا نام براہ راست نہیں لیا پھر بھی کوئی نادان ہی یہ یقین کر سکے گا کہ حملہ کا نشانہ سید شہاب الدین نہیں کوئی دوسرا تھا۔ یا یہ کہ ان کے مقاصد درحقیقت دینی ہیں۔ جو انہوں نے اپنی میٹنگ کی پاس شدہ قرارداد میں گنائے ہیں۔ یہ قرارداد تو صرف ایک پردہ ہے۔ حقیقی پوشیدہ عزائم یہ ہیں کہ قیادت پر قبضہ کیا جائے۔ کیوں کہ قوم کی ترجمانی کا وہ خود کو تنہا حق دار سمجھتے ہیں۔ سید شہاب الدین اور امام بخاری جو کل تک ایک دوسرے کے رفیق بنے ہوئے تھے آج الگ ہو گئے ہیں۔ بشاید حکمت عملی کی وجہ سے ہی امام بخاری نے خود کو اعتدال پسند کے طور پر پیش کیا مگر جیسے ہی سید شہاب الدین دوبارہ گرفت مضبوط کرنے کے لئے سرگرمیاں دکھائیں گے اور اپنے خیمے نصب کرنے لگیں گے تو امام صاحب اس کی تقلید پر اُتر آئیں گے۔ کیوں کہ جب بھی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے مذہب اور سیاست کو ایک ساتھ جوڑا گیا تو ہمیشہ یہی شکل سامنے آئی ہے۔

دریں اثنا حکومت اپنے حقیر سے فائدہ کے لئے توقع ہے کہ کسی ایک کو سر چڑھانے کی کوشش کرے گی، لیکن موجودہ مرحلہ میں کسی بھی گروپ کے ساتھ بات کرنا بیوقوفی ہوگی۔ کیوں کہ جس کسی کو نظر انداز کر دیا جائے گا وہ اپنے مطالبے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگے گا۔ اس سے مخالف گروپ بھی مزید بڑھے چڑھے مطالبے کرنے پر مجبور ہو جائے گا جیسا کہ اکالیوں نے سنہ ۱۹۸۱ء اور سنہ ۱۹۸۳ء کے درمیان کیا۔

موجودہ جو فضا ہے اس میں مسئلہ کا کوئی "معقولیت پسندانہ" حل تلاش کرنے کی کوشش کسی کو مطمئن کئے بغیر ناکام ہو جائے گی۔ سید شہاب الدین نے جب انتہائی غصہ میں اپنی ذہانت سے کام لے کر رشدی کی کتاب پر پابندی عائد کرانے میں کامیابی حاصل کرلی تو اس میں صرف جذبات کو ہی دخل تھا۔ جذباتیت جتنا زبردست اثر ہندوؤں پر چھوڑتی ہے اتنا ہی مسلمانوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اس لئے تمام فریقین کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ سیاسی طاقت کے مظاہرہ میں وہ بابری مسجد یا رام جنم بھومی کو بطور آلہ استعمال نہیں کریں گے۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا، آنے والے جنرل الیکشن کی مصلحت

کے باوجود حکومت کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ وہ جوش کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرے۔

(انڈین ایکسپریس ۹ نومبر ۱۹۸۸ء)

۲۔ بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ سے متعلق اپنا دعویٰ پیش کرنے کے لئے مسلمانوں نے ایک اور تنظیم کی تشکیل میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ کیوں کہ آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی تشکیل میں بہت زیادہ انتشار و تضاد رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ تنظیم شہاب الدین کی سربراہی والی بابری مسجد رابطہ کمیٹی سے انحراف کرنے والوں نے مؤخر الذکر کی "مطلق العنانی" اور متنازعہ عبادت گاہ کے لئے چلائی جانے والی تحریک کے سلسلہ میں مضبوط فیصلہ نہ کئے جانے پر احتجاجاً بنائی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نئی تنظیم نے یک طرفہ طور پر اپنی منتظمہ کمیٹی میں نہ صرف شہاب الدین کے گروپ سے تعلق رکھنے والوں کے نام شامل کر رکھے ہیں بلکہ ایجی ٹیشن کی قیادت رابطہ کمیٹی کے ہی ذمہ رہنے دی۔ ظاہر ہے کہ دونوں گروپوں کے درمیان تنازعہ و اختلاف تحریک کو چلانے کے طریق کار سے ہی تھا۔ نئی تنظیم سے تعلق رکھنے والے یو۔پی کے چند لیڈران نے نام نہاد معتدل رویہ کے لئے شہاب الدین کو لعنت ملامت کی۔ اس کے باوجود دہلی کی دو روزہ کانفرنس میں جس کے اختتام پر نئی تنظیم وجود میں آئی۔ اس کے چیئرمین صلاح الدین اویسی اور جامع مسجد کے شعلہ نوا شاہی امام سید عبداللہ بخاری نے بھی اعتدال پسندی کی تلقین کر ڈالی۔ مسٹر اویسی تو یہاں تک کہہ گئے کہ وہ مسلمانوں کی لاش پر سے گزر کر اپنی لیڈرشپ نہیں چاہتے۔ یو۔پی کے ایک لیڈر نے دوسرے معاملات اٹھائے جانے پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ نئی تنظیم کا دائرہ کار صرف بابری مسجد کی بازیابی تک ہی محدود رہنا چاہیے

گرچہ یہ سچ ہے مگر یہ سادہ لوحی ہوگی اگر اس تقسیم کو صرف شخصیتوں کے تصادم اور شہاب الدین کے کام کرنے کے طریقہ سے اختلاف کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ بلکہ یہ پیچیدہ صورت حال مسلم لیڈرشپ میں عمیق بحرانی کیفیت پائے جانے کی عکاس ہے۔ دہلی کی کانفرنس میں دوسرے معاملات جیسے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی، سماجی اور معاشی بدحالی کا ذکر جس نمایاں طریقہ سے کیا گیا وہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ ہر شخص یہاں تک کہ

تھوڑی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ ملک کے مسلمانوں کی بدحالی کی وجہ یہی خرابیاں ہیں۔ مسٹر شہاب الدین اور مسٹر اویسی کی مجبوریاں یہ ہیں کہ ایک بار وہ بابری مسجد کے سر پر سوار ہو گئے ہیں تو اب اس پر سے نیچے نہیں اُتر سکتے۔ متنازعہ عبادت گاہ کے سلسلہ میں مسلمانوں میں جو بے اطمینانی پائی جاتی تھی اس کو ان لوگوں نے اہم جذباتی مسئلہ بنا دیا ہے کیوں کہ اس ذریعہ سے ہی وہ عوام میں مقبول ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست داں جو قیادت کے خلاء کو پُر کرنے کے عزائم رکھتے ہیں اپنی ہوس کو پسِ پشت نہیں ڈال سکتے۔

(ٹائمز آف انڈیا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۸ء)

۳۔ شاہی امام جامع مسجد سید عبداللہ بخاری اور ان کے انتہا پسند ساتھیوں نے جو آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس کے عہدہ داروں کو مسٹر شہاب الدین نے خارج کر کے ان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اجودھیا کے عبادت خانہ کی بازیابی کی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ انہوں نے ایک نباض سیاست داں کی حیثیت سے یہ بات محسوس کر لی کہ انتہا پسندوں نے اپنی تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دے کر نہ صرف توہین کرنے کی بلکہ مسلم قوم میں ان کے اثرات کم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مسٹر شہاب الدین کا یہ کہنا کہ اس "تخریب کاری" کے پیچھے ان کا "ذاتی مفاد" پوشیدہ ہے حقیقت سے قریب ہے۔ امام صاحب کے حامی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ٹوٹ کر الگ ہو جانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انہیں خدشہ تھا کہ سیاسی دھاروں میں ان کے کردار گم ہو کر رہ جائیں گے خاص کر یو۔پی میں جہاں مسلمانوں کا ووٹ بہت زیادہ ہے اس لئے اپنی بقاء کے لئے ایسا کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ مسٹر شہاب الدین بھی مخالف گروپ کے اس الزام کی تردید نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کی نظروں میں اپنی مقبولیت بنائے رکھنے اور زیادہ سے زیادہ شہرت حاصل کرنے کی خاطر ہی انہوں نے متنازعہ عبادت گاہ کو "آزاد" کرانے کے لئے مارچ کا اعلان کیا تھا۔ اسے اس لئے واپس لے لیا کہ وہ جنتا پارٹی کی ایم۔پی حیثیت کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں علی گڑھ اور مغربی یو۔پی کے بعض علاقوں میں فسادات بھی پھوٹ پڑے تھے۔

بہرحال مسٹر شہاب الدین نے تنظیم کو دو حصوں میں منقسم ہونے پر مجبور کر کے اپنے حق میں اچھا کیا ہے۔ بنیاد پرستوں کے ساتھ جانب داری کرنے کا جو داغ ان پر لگا ہوا تھا اسے اس طرح دھونے میں جزوی طور پر وہ کامیاب رہے ہیں۔ پیر کے دن ان لوگوں نے جو غیر محتاط بیانات دئے اسے شہاب الدین اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انتہا پسندوں نے زیادہ شدت و طاقت سے تحریک چلانے کا عزم کر کے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ گفت و شنید کے ذریعہ معاملہ حل کئے جانے کے خلاف ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح شاہی امام اور ان کے حواری مسئلہ کے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان حالات میں مسٹر شہاب الدین کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، اگر وہ صدق دل سے تحریک کو سیکولرزم اور نظم و نسق کی ایک کسوٹی تصور کرتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی ہر کوشش کا ساتھ دیں جو بجائے مقابلہ آرائی کے گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کی جائے۔ کیوں کہ مقابلہ آرائی سے دونوں فرقوں کے درمیان بدگمانیاں بڑھیں گی اور فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے۔ دریں اثناء عوام تو توقف سے کام لیں گے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ دوسرے فریق کیا کہتے ہیں۔ کیوں کہ دوسرے فریق نے وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر دھرنا دینے اور لکھنؤ میں عوامی مظاہرہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جو دراصل بے ضرر دکھائی دیتا ہے مگر مذہبی جوش و جذبہ کب اور کیسے بھڑک اٹھے گا کوئی نہیں جانتا۔

(اسٹیٹسمین، ۲، دسمبر سنہ ۱۹۸۸ء)

(ص ۶۹ تا ۷۱، ماہنامہ حجاز جدید دہلی، جنوری ۱۹۸۹ء)

بدایوں سے بھاگل پور تک

جب کسی قوم کا عہدِ زوال شروع ہونے لگتا ہے تو وہ جوشیلی جذباتی تقریروں کی خوگر ہو جاتی ہے۔ الفاظ سے کھیلنے والوں کے پیچھے دوڑنے لگتی ہے اور اپنے مخلص محسنوں اور صحیح رہنماؤں کو پس پشت ڈال دیتی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم اپنے خودغرض جذباتی لیڈروں کے پیچھے پیچھے کسی ایسے نازک موڑ تک پہونچ جاتی ہے جس کے آگے "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" والی خطرناک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت ہر باشعور ہندوستانی اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ "بھارت ورش" کے اندر "دھارمک بھاؤناؤں" کو اپنے حقیر مفادات کے لئے کس بری طرح سے برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ اور حقیقی مسائل سے ہندوستانی عوام کو دُور رکھنے کی کیسی چالیں چلی جارہی ہیں۔ اور سیاسی شعبدہ بازیوں اور قلابازیوں کے کیسے گھناؤنے مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔

شاطر سیاسی ذہن کبھی یہ سوچتا ہے کہ بھارت کو "ہندو راشٹر" گھوشت کیا جانا چاہئے۔ تو کبھی "رام راجیہ" کی بانسری بجانے لگتا ہے۔ کبھی اردو کے لئے کئے گئے سنہریں وعدوں کی تکمیل کا مناسب سیاسی وقت دیکھ کر دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا اعلان کر دیتا ہے۔ تو کبھی قانونی سقم کی وجہ سے بیجا مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کرنے لگتا ہے۔ کبھی ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتا ہے۔ تو کبھی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگتا ہے۔ کسی صوبے اور کسی حادثے کے مہلوک و مقتول کی جان کی قیمت لاکھ روپے یا اس سے زائد ہوتی ہے۔ اور کسی مقتول کی بے گور و کفن لاش کنوؤں اور کھیتوں میں پڑی رہنے دیتا ہے۔ کسی زبان و قلم کو لکھنے بولنے کی کھلی چھوٹ دے دیتا ہے۔ اور کسی کی بات بات پر روک اور پہرے؟ ایسے حوصلہ شکن ماحول میں ہر سنجیدہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

ع خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

ستمبر ۱۹۸۹ء کے آخری ہفتے میں بدایوں سے چلنے والی ایک ٹرین کو روک کر تقریباً دو سو
مسلمانوں کو لاٹھی، بلم اور کدال پھاوڑے سے شہید کر دیا گیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد اندور کے ایک جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم (جس کی
قیادت الحاج عبد الغفار نوری صاحب کر رہے تھے، جنہوں نے شاہ بانو سے توبہ نامہ حاصل
کیا تھا) پر حملہ کر کے تقریباً بیس مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۹ء سے بہار میں کشت و خون کا سلسلہ جاری ہے۔ مونگیر، ہزاری باغ،
سہسرام، دربھنگہ، سیتامڑھی کے علاوہ صرف بھاگل پور میں ایک مکان کے اندر محصور
تقریباً ڈیڑھ سو مسلمان جو پولیس کی نگرانی میں تھے، انہیں نہایت بیدردی کے ساتھ شہید
کر دیا گیا اور درجنوں مسلم آبادیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ مشہور دینی عالم و خطیب حضرت
مولانا سید اشتیاق عالم صاحب ولی عہد سجادہ نشین خانقاہ شہبازیہ بھاگلپور کو گرفتار کر لیا گیا۔

سانحہ بھاگلپور سے متعلق ۴ر نومبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں انڈین اکسپریس نئی دہلی نے
اپنے ایک نامہ نگار راہل پاٹھک کی رپورٹ چھاپی ہے جو بڑی دردناک ہے۔ اس نے لکھا ہے:
"فوج نے تقریباً ایک سو لوگوں کی جان بچائی اور ان کو ایک بڑے مکان میں پہنچا کر
وہاں پولیس کا پہرہ لگا دیا۔ دوسری صبح جب فوج کے لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ
مکان جل رہا تھا۔ پہرے پر لگائے گئے پولیس والے غائب تھے۔ خون کے دھبے اور پھٹے ہوئے
کپڑے گاؤں کے تالاب تک بکھرے ہوئے تھے اور تالاب میں لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن
پر زخم کے نشانات موجود تھے۔ لاشیں اب بھی برآمد ہو رہی ہیں، تالاب سے بھی، کھیتوں سے
بھی اور گاؤں کے کنوؤں سے بھی۔"

"جن فوجیوں نے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو تقریباً ایک سو افراد کی جان بچالی تھی، لیکن
۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کی صبح ان کی لاشیں دیکھی گئیں۔ ان میں سے ایک فوجی کا کہنا ہے کہ یہ حالت
دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ
کر رو دوں۔"

بہار ملٹری پولیس نہایت ڈھٹائی کے ساتھ شرپسند عناصر کا ساتھ دیتی نظر آ رہی ہے۔

بھاگل پور کے ایس۔پی مسٹر کے۔ایس دویدی کو حکومتِ بہار نے ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ٹرانسفر کرنے کا حکم دیا۔ اور اس پر عمل بھی ہو گیا، لیکن دوسرے ہی دن اسے نامعلوم اسباب کی بنا پر پھر بحال کر دیا گیا۔ اور یہ سب وہی ہو رہا ہے جو وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور پولیس کے شرپسند عناصر چاہ رہے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نااہل انتظامیہ کی جانب سے ان عناصر کو اسی طرح چھوٹ مل رہی ہے جیسی ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے خلاف فرقہ پرست ہندوؤں کی طرف سے پورے ملک میں دو تین روز تک علانیہ اور بے خوف وخطر جان و مال کی تباہی و بربادی کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔

اور اب تو سیاسی مبصرین بڑی صفائی کے ساتھ اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ۱۹۸۴ء کا الیکشن گولڈن ٹمپل (امرتسر) پر حملہ کر کے جیتا گیا تھا۔ اور ۱۹۸۹ء کا الیکشن بابری مسجد اجودھیا کی متنازعہ زمین پر "شیلانیاس" کے ذریعے جیتے جانے کی ایک عرصے سے تیاری کی جا رہی ہے۔ اور اس وقت اس کا دورِ شباب چل رہا ہے۔ اور ہندوستانی جمہوریت وسیکولرزم کو الیکشن کے عارضی مفاد کی کُند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔

ہمیں یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ بابری مسجد تحریک کے کاندھوں پر سوار بعض مسلم لیڈر جن کی حکمت عملی بوٹا سنگھ کی میز پر تیار ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی سیاست کی دوکان چمکانے کی خاطر مسلمانوں کو اس خوفناک مرحلے تک پہنچایا۔ جس طرح اس حقیقت کا اظہار کرنے میں ہمیں کوئی خوف دامن گیر نہیں کہ بابری مسجد ایک منظم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ۹؍ نومبر ۱۹۸۹ء کو فرقہ پرست ہندو تنظیموں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر حکومتِ وقت نے بدترین موقع پرستی کا ثبوت دیا۔ اور ہندو پریشد و بجرنگ دل اور بی جے پی کی مُردہ رگوں میں اس نے اپنی غلط حکمت عملی سے ایک تازہ خون دوڑا دیا ہے۔

موجودہ حالات کے تحت مسلمانوں کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ ضبط و تحمل اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کرتے رہیں۔ محتاط و معقول انداز میں اپنا کیس عوام اور حکومت کے سامنے پیش کر کے رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کرتے رہیں۔ اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کے تشخص کا، ہر معاملہ

میں وہ دُور اندیشی اور اعتدال ہی کا راستہ اختیار کریں۔

جس وقت جس کام کی ضرورت اور اہمیت ہو اس کو سامنے رکھیں اور شخصی مفادات سے بے نیاز ہو کر اجتماعی مفادات کی تکمیل کے اسباب فراہم کریں۔ اگر خود بھاگل پور کے سلسلے میں اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو ایک طرف مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ کا کردار ملاحظہ فرمائیں کہ ہماری معلومات کی حد تک انہوں نے اخباری بیانات ہی کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے۔ جب کہ دوسری طرف علامہ ارشد القادری صاحب صدر کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس ہیں۔ جو ۵ر نومبر ۱۹۸۹ء سے بھاگل پور میں خیمہ زن ہیں اور ریلیف کے کاموں کی نگرانی فرمار ہے ہیں۔

حریفوں اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہوتے رہنا کوئی عقل مندی نہیں۔ دانش مندی اور دُور اندیشی اس میں ہے کہ بیہودہ چھیڑ چھاڑ کے باوجود کارواں کو اپنی منزل کی سمت رواں دواں رکھا جائے اور غیر ضروری کاموں کی طرف توجہ کئے بغیر بنیادی معاملات و مسائل کو پیش نظر رکھا جائے جیسا کہ تاریخ عالم میں زندہ قوموں کی بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے نامساعد حالات پہ قابو پا کر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہم چشموں پہ غلبہ پالیا۔ اور اپنے ہم وطنوں کے درمیان سُرخرو ہو کر ایک مثالی اور آبرو مندانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

بدایوں سے بھاگل پور تک ہمیں جو کچھ نظر آرہا ہے اس کی روشنی میں حکومت وقت سے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ افلاس و نااہلی کے ساتھ تو حکومت الٹے سیدھے کسی طرح چل سکتی ہے اور چل جاتی ہے، لیکن ظلم و بربریت کا عفریت جب اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے تو پھر رعایا کا خون چوسنے کے بعد اس کا خونیں پنجہ خود اسی کے شہ رگ کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور اس کی گرفت اس وقت تک ڈھیلی نہیں پڑتی جب تک اس ظالم حکومت کا سر دلاشہ کرسئ اقتدار کے نیچے نہیں آجاتا۔

یہ ہے تاریخ عالم کا تسلسل اور یہ ہے زبانِ خلق جس پر وقت سے پہلے جو حکومت کان نہیں دھرتی اسے یہ تغیر پذیر زمانہ دیکھتے ہی دیکھتے اٹھا کر اپنے کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔

بنارس (یوپی)، ہبلی (کرناٹک)، وغیرہ سے بھی اطلاعات مل رہی ہیں کہ وہاں شر پسند عناصر کھلے عام چاقو زنی اور آتش زنی کی وارداتیں کر رہے ہیں۔ جب کرفیو لگتا ہے تو امن پسند شہری گھر کے اندر جاتے ہیں اور فسادی عناصر اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور موقع ملتے ہی آگ اور خون کی ہولی کھیلنے لگتے ہیں۔

ایسے قیامت آشوب حالات میں اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ صرف خدا اعتمادی اور خود اعتمادی ہی ہماری کمزوریوں، پریشانیوں اور مصائب و آلام کا علاج ہے۔ اور اس کے علاوہ ساری تدبیریں بیکار اور ساری کوششیں لاحاصل ہیں۔ کیونکہ

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

(از لیٰس اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۹ء)

تحفظ بابری مسجد کا مطالبہ و تائید

اجودھیا کی بابری مسجد جو صدیوں سے مسلمانانِ ہند کے سجدوں سے آباد تھی اس میں چند شر پسندوں نے ۲۱/۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں بُت رکھ کر جس دیدہ دلیری کے ساتھ امن و قانون کا شیرازہ منتشر کرنے کی سازش کی اور مسلمانوں نے پُرامن احتجاج و بیان اور عدالتی کارروائی کا سہارا لے کر اس المیہ سے جس طرح نمٹنے کی کوشش کی اس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا طبقہ اچھی طرح واقف اور باخبر ہے۔

اسی طرح یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد کی لوکل کورٹ کے فیصلے پر جس ڈرامائی انداز سے عمل درآمد ہوا۔ اخبارات کے ذریعہ جس طرح اس کی تشہیر کی گئی اور بھارتی ٹیلی ویژن پر اس کے مناظر نہایت جانبدارانہ انداز سے دکھا کر عوام کے مذہبی جذبات پر جس طرح شب خوں مارا گیا وہ ابھی کل ہی کا ایک افسوسناک واقعہ اور بھارت کی سیکولر تاریخ کا ایک شرمناک حادثہ ہے۔

جس کا یہ المناک نتیجہ سامنے آچکا ہے کہ "شیلانیاس" (۹ر نومبر ۸۹ء) سے کچھ پہلے اس وقت کی حکمراں پارٹی نے فرقہ پرستوں کے دباؤ میں آکر نہ صرف یہ کہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ اس کا بھی اعلان کرا دیا گیا کہ جس جگہ شیلانیاس ہونے جارہا ہے وہ جگہ غیر متنازعہ ہے۔ حالاں کہ تاریخی اور عدالتی ہر اعتبار سے یہ اعلان غلط اور بے بنیاد تھا۔

اب "ہندو راشٹر" کی علمبردار پارٹیاں وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی بزورِ طاقت ۳۰ر اکتوبر ۹۰ء کو بابری مسجد توڑ کر اس کی جگہ رام جنم بھومی تعمیر کرنے کا کھلم کھلا اعلان کر رہی ہیں۔ جگہ جگہ اشتعال انگیز جلسہ و جلوس کا اہتمام کیا جارہا ہے اور خون کھولا دینے والے فتنہ پرور نعروں سے ہندوستان کی جمہوری فضا میں زہر گھولا جارہا ہے۔

ان حالات و واقعات کی روشنی میں کوئی بھی سنجیدہ ہندوستانی شخص یہ رائے قائم

کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ بھارت کی وحدت وسالمیت کو اس وقت سنگین خطرات سے دوچار
کرنے والی جماعت اور پارٹی کوئی اور نہیں بلکہ صرف اور صرف وشو ہندو پریشد، اور بھارتیہ
جنتا پارٹی،، ہے۔ ساتھ ہی ایک خوش آئند بات یہ بھی نظر آرہی ہے کہ تاریخی دستاویز، منھ بولتے
حقائق اور عدالتی کارروائی سے بھاچھپا کر فرقہ وارانہ جنون پیدا کرنے والی یہ دونوں مذہبی و
سیاسی پارٹیاں اب ملکی سطح پر اپنے آپ کو یکہ وتنہا محسوس کرنے لگی ہیں۔ اور ایک اطمینان بخش
بات یہ بھی ہے کہ ہندوستانی رائے عامہ کی اکثریت اس حقیقت کو اچھی طرح تسلیم کر چکی ہے کہ بابری
مسجد کو منہدم کرکے مندر بنانا اس ملک کی سیکولر بنیاد کو ہلا کے رکھ دے گا۔ اخبارات، سیمینار
اور عام جلسوں میں معتدد شخصیات کی تقاریر اور رائے عامہ جاننے کے دوسرے ذرائع سے
ایک لحاظ سے ریفرنڈم ہو چکا ہے کہ بابری مسجد صرف بابری مسجد ہے، اور آئین، قواعد اور شہادت
کی بنیاد پر جو عدالتی فیصلہ ہوگا وہ یقیناً بابری مسجد کے ہی حق میں ہوگا۔

اس وقت امن پسند حلقوں میں اس تجویز کا چرچا ہے کہ بابری مسجد، رام جنم بھومی
قضیہ کو حقائق کی بنیاد پر حل کرنے کے لئے ہندوستان کی سربرآوردہ مذہبی شخصیات کی مشترکہ
میٹنگ کی جائے اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اس الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھایا جائے۔

اس مثبت تجویز کا ہم فراخدلی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور ہر اس فیصلہ کا مستقبل میں
بھی خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کریں گے جو عدالتی کارروائی یا باہمی گفت وشنید کے ذریعہ تاریخی
شہادت اور حقائق واصول کی بنیاد پر کیا جائے۔ جس سے مسجد کی شرعی حیثیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے
اور جس سے ہندوستان کا سیکولر وقار اور اس کی جمہوری عظمت بھی پامال اور مجروح ہونے نہ پائے

مرکزی حکومت اور حکومت صوبہ اترپردیش کی جانب سے امن وقانون بحال رکھنے اور بابری مسجد
کو تحفظ دینے کے سلسلے میں جو مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں انہیں ہم قدر ومنزلت کی نگاہ سے
دیکھتے ہیں اور ان سے مخلصانہ مطالبہ کرتے ہیں کہ متعدد فرقہ پرست تنظیموں کی جانب سے امن وشانتی
بھنگ کرنے اور آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے لئے جو تیاریاں کی جارہی ہیں ان پر فوری طور پر پابندی
عائد کی جائے۔ اور ایسے شرپسند عناصر کو ۳۰؍اکتوبر ۹۰ء سے پہلے پہلے قانون کے حوالہ کرکے ایودھیا
دیگر حساس مقامات پر انتظامیہ کی جانب سے لا اینڈ آرڈر کی بالادستی قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے

(از یٰسٓ اختر مصباحی۔ ص ۱۷، ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ نومبر ۱۹۹۰ء)

سومناتھ سے اجودھیا تک

بابری مسجد کے ساتھ رام جنم بھومی کا تصور زبردستی جوڑ کر انگریزوں نے فتنے کا جو بیج تقریباً پونے دو صدی پہلے بویا تھا وہ اب ایک تناور درخت بن چکا ہے اور اس کی جڑیں زمین کے اندر دور دور تک پھیل چکی ہیں۔

پہلے تناتی مسجد، ہنومان گڑھی مسجد پر جھگڑے ہوئے اور بعد میں بابری مسجد کو نشانہ بنایا گیا۔ حالاں کہ اگر رام جنم بھومی کا اس جگہ سے کوئی تعلق ہوتا تو سب سے پہلے یہیں معرکہ آرائی ہوتی اور دوسری مساجد کی طرف بعد میں رُخ کیا جاتا۔ لیکن انگریزوں کا شاطرانہ ذہن جب تاجرانہ بھیس میں آکر پورے ہندوستان پر قبضہ کرسکتا تھا تو رام کی جائے پیدائش کو اجودھیا میں ڈھونڈ نکالنا اور ایسی جگہ کو منتخب کرلینا اس کے لئے کیا مشکل تھا جس کی نسبت ایک مغل شہنشاہ بابر کی طرف ہوتا کہ ایک نیا تنازعہ کھڑا کر کے اگر ایک طرف مذہبی جذبات مشتعل کئے جائیں اور انہیں مسجد کو منہدم کر کے اس جگہ رام جنم بھومی تعمیر کرنے کی مہم پر لگایا جائے تو دوسری طرف بابر کو حملہ آور کی شکل میں پیش کر کے اس کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف جذبات ابھارے جائیں اور ہندو مسلمان دونوں کو ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑا کر کے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر دیر تک عمل کیا جاتا رہے۔

جس طرح بابری مسجد کے اندر رام جنم بھومی کا تصور پیدا کئے جانے کے پس پردہ سیاسی اغراض و مقاصد کارفرما تھے اسی طرح آج اسے عملی شکل دیئے جانے کا واضح مقصد بھی صرف اور صرف ایک "ہندو راشٹر" کا قیام ہے جس کا اعلان "شیلا نیاس" (۹ نومبر ۱۹۸۹ء) کے موقع پر وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل نے صاف الفاظ میں کردیا تھا۔ اور شری ایل۔ کے ایڈوانی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی کی رتھ یاترا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس نے شہر شہر اور نگر نگر نفرت کی آگ سلگانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی

سومناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا کا پروگرام بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا تھا اور اس کے ذریعہ ہندوؤں کو یہ پیغام دینا تھا کہ ایک بیرونی حملہ آور محمود غزنوی نے سومناتھ کو توڑا تھا جس کی آزادیٔ ہند کے بعد سردار پٹیل نے غیر سرکاری سطح پر تعمیر جدید کرائی تھی، لیکن اجودھیا کی رام جنم بھومی جس کی جگہ پر بقول ان کے بابر کے گورنر میر باقی نے مندر کو توڑ کر مسجد بنا دیا تھا۔ اب اس جگہ کو واپس لے کر ایک عالی شان مندر بنانے کا جو کام باقی رہ گیا تھا اس کی تکمیل شری ایڈوانی کے ذریعہ ہو گی۔

جگہ جگہ اس یاترا کی سواگت میں ترشول، تلوار، ہتھیار اور خون پیش کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم ہر طرح کی جنگ کے لئے آمادہ ہیں اور ضرورت پڑی تو خون دینے اور خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

۳۰ر اکتوبر ۹۰ء کو ہوا بھی یہی کہ اجودھیا اور ملک کے پچاسوں شہروں میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اور فرقہ پرستی کا عفریت عریاں ہو کر شارع عام پر اس طرح رقص کرنے لگا کہ باغیرت ہندوستانیوں کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں اور اس عفریت کے خونیں پنجوں نے قانون و انتظام اور بھارتی جمہوریت و سیکولرازم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

ایک سیاسی مبصر نے اجودھیا کے حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ۳۰ر اکتوبر کو یہاں ہندو مسلمان اور حکومت تینوں کو بیک وقت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مسلمان تو اس طرح ناکام ہوئے کہ اپنی جوشیلی تقریروں اور بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اجودھیا کا رخ کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔ اور ہندو اس طرح ناکام ہوئے کہ پوری قوت کے ساتھ ہزاروں کی بھیڑ اکٹھا کر کے بھی بابری مسجد کو شہید نہ کر سکے جب کہ حکومت کو اس طرح ناکامی ہاتھ آئی کہ وہ ہزار انتظام کے باوجود کارسیوکوں کو اجودھیا اور بابری مسجد کے اندر گھسنے اور اسے نقصان پہنچانے سے نہ روک سکی۔

حالاں کہ مسلم لیڈر یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ ہم سر پہ کفن باندھ کر بابری مسجد کا تحفظ کریں گے۔ ہندوؤں کا اعلان تھا کہ ۳۰ر اکتوبر کو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں رام جنم بھومی کی تعمیر سے نہیں روک سکتی۔ اور حکومت یو۔پی کا یہ دعویٰ تھا کہ مذکورہ تاریخ کو اجودھیا میں

کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ پھر بھی بڑی اچھی بات یہ ہوئی کہ ہندو مسلمان وہاں آمنے سامنے نہیں آئے ورنہ بڑا زبردست ٹکراؤ ہوتا اور خون کی ندی بہہ جاتی۔

بہر حال ۳۰، ۳۱ اکتوبر کی قیامت سر سے گزر گئی۔ جس کی ہولناکی سے پورا ہندوستان لرز اٹھا اور حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ ساتھ ہی مسلمانانِ ہند کو وہ یہ سبق بھی دے گئی کہ کوئی بھی حکومت جس طرح اس بات کی کھلی ہوئی اجازت نہیں دے سکتی کہ عبادت گاہ کو زبردستی توڑا جائے اسی طرح اس کے لئے سیاسی طور پر یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ بڑھتی ہندو فرقہ پرستی کو بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کر دے۔ لکھنو اور دلی میں دو تین ہفتہ تک جو زبردست سرگرمیاں جاری رہیں اور سازشوں کے جو جال بُنے گئے ان سے یہاں کے قریبی حلقے بخوبی واقف ہیں۔

کئی ایک مسلم حلقے یہ بات تیزی سے اٹھانے لگے ہیں کہ اجودھیا تنازعہ چونکہ ایک خطرناک شکل اختیار کر چکا ہے اس لئے اسے اب عوامی سطح پر نہیں اٹھانا چاہئے اور جلسہ و جلوس سے سخت پرہیز کرنا چاہئے کیوں کہ اس سے فرقہ پرست ہندو تنظیموں کو فائدہ پہونچ رہا ہے اور وہ ہندوؤں کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ ہندو راشٹر کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے میں کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہیں جب کہ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی متبادل منصوبہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ خود اپنے آپ کو ان کی طرح منظم کر پا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ حیرت انگیز الزام بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ "وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس نے اپنے کچھ لوگوں کو بھی بابری مسجد تحریک میں شامل کر دیا ہے جس کا مقصد مسلسل ایسے کام اور ایسی بات کرتے رہنا ہے جس سے کشیدگی بڑھتی رہے اور فرقہ پرست طاقتیں اکثریتی فرقہ میں ان کا ردِ عمل جگا کر اپنی مقصد برآری کرتی رہیں۔"

(ص ۱ ہفت روزہ بلٹز بمبئی نومبر سنہ ۱۹۹۰ء)

اسی طرح بعض مسلم دانشور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ فرقہ پرست ہندو تنظیمیں "رام" اور بابر کا مقابلہ کر کے ہندو جذبات کا استحصال کر رہی ہیں۔ رام بھکتوں کی فوج تیار کر رہی اور بابر کو حملہ آور کے روپ میں پیش کر کے مسلمانوں کے خلاف انہیں بھڑکا رہی ہیں۔ انہوں نے

بابر کا نام اس مسجد سے نکال دیا جائے اور اس کے نام کا غیر ضروری استعمال کرنے سے گریز کیا جائے۔ کیوں کہ ہمارے اوپر مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تو ہے مگر بابر کے تحفظ کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اس کے نام کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان کیوں خواہ مخواہ کی مشکلات کا شکار ہوں۔ رہ جاتی ہے یہ بات کہ مسجد کا تحفظ کس طرح کیا جائے تو اب بظاہر اس کی دو ہی شکلیں باقی رہ گئی ہیں جو ممکن العمل ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ مسلم علماء و قائدین اور ہندو ذمہ دار آپس میں بات چیت کر کے کوئی حل نکالیں۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے۔ عوامی احتجاج تو مسلمان بہت کر چکے۔ اور طاقت کے ذریعہ مسجد کے تحفظ کا جہاں تک سوال ہے تو فی الحال دُور دُور تک اس کے بظاہر کوئی آثار نہیں۔

مسئلہ کے تصفیہ کے لئے بات چیت کے کئی دور فریقین کے درمیان چل چکے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہندو لیڈروں کی جانب سے کبھی تو ایسی پیشگی شرطیں رکھ دی جاتی ہیں جنہیں ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور کبھی تاریخی دستاویزات اور حقائق و شواہد کو پسِ پشت ڈال [illegible] یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ رام جنم بھومی یہیں ہے اور یہاں سے ان کی بھاؤنائیں (جذبات) جڑ گئی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ [illegible] ہی اسے ہندوؤں کے حوالہ کر دیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک میٹنگ میں ایک بڑے سوامی جی نے کھڑے ہو کر دامن پھیلاتے ہوئے درخواست کی کہ مسلمان اس کو ہندوؤں کو بطور تحفہ عنایت کر دیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ مسجد کی خرید و فروخت اور اس کی منتقلی کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ نہ ہی اس کا کوئی حصہ کسی کے حوالہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ہندو بھاؤنائیں جڑنے کی وجہ سے اسے دامن پھیلا کر مانگنے کی بات بظاہر تو کسی کو اچھی لگ سکتی ہے مگر مسلمانوں کے تعلق سے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص بڑی منت و سماجت کے ساتھ کسی سے عرض کرے کہ حضور! ہم تو [illegible] کی گردن کاٹنا اور اس کا خون چوسنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ آپ کا خون چوسنے کے لئے [illegible] بھاؤنا جاگ اٹھی ہے۔

ایک طرف تو دامن پھیلا کر مسجد مانگی جا رہی ہے اور دوسری طرف اشوک سنگھل کی

کی قیادت میں ترشول دھاریوں کی فوج اجودھیا پر چڑھائی کر کے مسجد کو زخمی اور لہو لہان کر ڈالتی ہے جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا نکالا جا سکتا ہے کہ اگر ہماری درخواست پر تمہیں مسجد ہمارے حوالہ کرنی ہے تو کردو ورنہ ہم تو بزورِ طاقت تم سے یہ مسجد چھین کر ہی دم لیں گے۔

اور ان بھاؤ ناؤں کا بھی عجیب معاملہ ہے کبھی رام چبوترہ سے متعلق ہوتی ہیں تو کبھی گربھ گرہ سے، اور شیلا نیاس کی جگہ سے۔ اور آگے بڑھتی ہے تو کاشی اور متھرا تک پہونچ جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بھاؤ ناؤں پر کوئی لگام بھی ہے یا ان کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا رہے گا۔ اور مسلمان کب تک اور کہاں تک ان بھاؤ ناؤں کو جھیلتے رہیں گے؟

عدالتی کارروائی کا سامنا کرنے سے ہندو لیڈر کترا رہے ہیں اور کھلم کھلا یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہم اس کے پابند نہیں۔ اور اس کا فیصلہ اسی وقت مانیں گے جب وہ ہمارے حق میں ہوگا۔ گویا وہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو قانون سے بالاتر بھی سمجھ رہے ہیں۔

اگر اس عدالتی کارروائی کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اس کی تین شکلیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی شکل تو یہ ہے کہ مقدمہ یوں ہی معلق رہے اور بتوں کی پوجا جاری رہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہندوؤں کے حق میں ہو جائے جو مسلمانوں کی نظر میں یقیناً حقائق وشواہد کے خلاف ہوگا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ اس کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہو جائے۔ جس کے خلاف فرقہ پرستوں کا پُر شور اور ہنگامہ خیز احتجاج ہوگا۔ اور اسے وہ کسی قیمت پر تسلیم نہیں کریں گے۔ اور حالات کے تیور بتا رہے ہیں کوئی بھی حکومت اب اس مسجد سے بتوں کو نکالنے کی جرأت نہیں کر سکے گی۔ کیوں کہ اسے حق وانصاف نہیں بلکہ اپنا اقتدار عزیز ہوگا۔ اور وہ اکثریت کے غم وغصہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

مسجد کا تالا کھلنے کے بعد یہ خبر بہت گرم تھی اور اب بھی سیاسی وصحافتی حلقوں میں کبھی کبھی اس کی گونج سنائی دیتی ہے کہ نفقۂ مطلقہ سے متعلق پارلیمنٹ میں بل پاس کرتے وقت کانگریسی حکومت سے مولانا ابو الحسن علی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے کچھ اس قسم کا معاہدہ کیا تھا کہ اگر بابری مسجد کا تالا کھلتا ہے تو ہماری جانب سے اس کے خلاف کوئی

تحریک نہیں چلائے گی۔ خدا معلوم اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے۔
لیکن ہفت روزہ بلٹز بمبئی کا یہ انکشاف پڑھ کر ہم حیرت زدہ ہو گئے جس میں اس نے مولانا موصوف کے معتمد خاص مولانا عبدالکریم پاریکھ خازن مسلم پرسنل لا، بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

• ناگپور میں آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر نے یہاں کے ایک مولانا کو، جن کے ترجمۂ قرآن نے ابھی حال ہی میں ہر مکتب فکر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ پیدا کر دیا تھا اور مولانا کو حیل حجت کے بعد اسے واپس لینے پر مجبور ہونا پڑا تھا، مسلمانوں کو یہ باور کرانے پر متعین کیا ہے کہ ہندوستان بھر میں فساد کی جڑ بابری مسجد رام جنم بھومی کا قضیہ ہے اور اگر مسلمان بابری مسجد سے دست بردار ہو جائیں تو ان کے جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان مولانا کے لئے تو کیا کسی کے لئے بھی یہ کہنا مشکل ہے۔ لہٰذا بڑی حکمت عملی اور نرم لہجے میں مسلمانوں کے درمیان حضرت عبدالمطلب کے اس موقف کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ "میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس کی بازیابی کے لئے آیا ہوں، کعبۃ اللہ کا مالک اللہ ہے اور وہی اس کی حفاظت کرے گا۔"

اس ضمن میں صلح حدیبیہ کا بھی حوالہ دیا جا رہا ہے۔

بلٹز کو معلوم ہوا ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا، بورڈ کے ایک سکریٹری نے کچھ مسلم ذمہ داروں کو فون کر کے انہیں ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا یہ بھی محض اتفاق ہے کہ مسلم پرسنل لا، بورڈ کے یہ شیخ محترم بھی مہاراشٹر میں آر ایس ایس، بی جے پی کے گڑھ میں رہتے ہیں؟ ان کی قوت پرواز بھی یہیں تک ہے کہ بابری مسجد سے دست بردار ہو جانے کا اعلان فرقہ پرستوں کے غم و غصہ کو سرد کر دے گا اور ملک میں یکجہتی کی فضا پیدا ہو گی۔" (نومبر ۱۹۹۰ء)

بہر حال! یہ سنگین حالات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء کے عشرہ میں ہندو فرقہ پرستی کا ایسا ہی ایک طوفان آیا تھا۔ جن سنگھ نے "گئو رکھشا" کا مسئلہ بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھایا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۶ء میں اس کے آدمیوں نے پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیا تھا اور آنجہانی کامراج کا گھر بھی جلا دیا تھا، لیکن اسے اپنے مقصد میں سخت ناکامی ہوئی۔ گائے اور بلراج مدھوک

دونوں ہندوستان کے سیاسی منظر نامے سے غائب ہو گئے۔

اگر تشدد اور زبردستی کا یہی سلسلہ جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب سنجیدہ ہندوؤں کی اکثریت اکتا کر اس جھگڑے سے الگ ہو جائے۔ جس کے بعد اجودھیا پر حملہ کرتے رہنے کا پلان بنانے والی وشو ہندو پریشد مایوس و نامراد ہو کر اپنے گھر بیٹھ جائے اور نتیجہ کے طور پر مسئلہ رام جنم بھومی واشوک سنگھل دونوں ہندوستان کے سیاسی منظر نامے سے غائب ہو جائیں۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ہم مسلمان اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ کا قرآنی فرمان ہمارے پیش نظر ہے۔ ہمیں سنجیدہ اور حکیمانہ تدبیریں جاری رکھنی چاہئیں اور فراستِ مومنانہ کا ثبوت دیتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ جلد از جلد کوئی اطمینان بخش صورت پیدا ہو۔ اور مسلمان امن و چین کی سانس لے سکیں۔ لَعَلَّ اللہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذالک امراً۔

(از لیٰس اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ دسمبر ۱۹۹۰ء)

مسلم قیادت پر ایک نظر

مسلم معاشرے میں گفتار کے غازیوں کی کمی نہیں۔ شہر شہر بلکہ محلہ محلہ ان کی بہتات ہے۔ ہوٹل اور چائے خانے میں ان کی گرما گرم گفتگو سنئے اور محفلوں جلسوں میں ان کی نوک جھونک دیکھئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ پر ان کا جلد ہی قبضہ ہونے والا ہے اور انتخابات کے موقع پر تو گویا پوری قوم کی زمامِ تقدیر ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

کوئی چلتا ہوا موضوع سامنے آجائے تو پھر ان کی چرب زبانی کا عالم نہ پوچھئے۔ اپنی زنبیل سے معلومات کے لیے ایسے خزانے نکال باہر کریں گے کہ سامعین کی سات پشتوں کو بھی ان کی ہوا نہ لگی ہو۔ بین الاقوامی مسائل بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہوتے۔ ان پر تبصرہ و تجزیہ کرتے وقت ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ کوئی ماہر سیاست داں اپنے بیش بہا تجربات کے جوہر لٹا رہا ہے۔

مساجد کے ائمہ اور خانقاہوں کے سجادہ نشینوں کے درمیان بھی اب سیاست کی دھوم مچنے لگی ہے۔ مذہبی اسٹیج کے مقررین بھی میلاد و سیرت کے جلسوں میں ہزاروں سامعین کو خطاب کرتے ہوئے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے لگے ہیں کہ وہ اگر میدانِ سیاست میں کود پڑیں تو یہ سارا مجمع حاضرین ان کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لئے ہر وقت تیار ملے گا اور کالجوں و یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے مسلم نوجوان تو سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر و سکریٹری تو یونین ہال سے نکل کر سیدھے اسمبلی یا پارلیمنٹ کے اندر چھلانگ لگانا اپنا پیدائشی حق گردانتے ہیں۔

آج کل کی سیاست میں اپنی جگہ بنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کچھ زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے۔ کسی بھی جذباتی مسئلہ کا دامن تھامئے اور سیاست کے چوتھے آسمان پر پہونچ جائیے۔ ضرورت پیش آئے تو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اعلان کرنے سے بھی دریغ نہ کیجئے۔

پھر دیکھئے آپ کا ستارۂ اقبال کس بلندی پہ پہونچ جاتا ہے اور یہ نسخہ اتنا آسان ہے کہ بس نہ پوچھئے ۔

چاہتے ہو گر سیاست میں عروج — اسٹرائک کرکے پہلے جیل جاؤ
کون سمجھے گا تمہارے دل کا حال — جان پر اپنی بظاہر کھیل جاؤ

تو اے مسلمانانِ ہند! ہمارے موجودہ مسلم لیڈروں کا حال کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں جس کی طرف مذکورہ سطروں میں اشارہ کیا گیا۔

۱۹۸۶ء میں مسلم لیڈروں کے ہاتھ ایک مسئلہ آگیا جسے بابری مسجد کا مسئلہ کہا جاتا ہے ۔اس کے کھنڈرات پہ چڑھ کے نہ جانے کتنے محلہ جاتی ورکر اپنے شہر اور ضلع کی سرحدوں تک پہونچ گئے۔ اور ضلعی و شہری سطح کے لیڈر صوبائی حیثیت اختیار کر گئے اور صوبائی پیمانے کے لیڈر ملکی سطح پر جانے پہچانے جانے لگے اور ملکی سطح کے متعارف لیڈر بین الاقوامی شہرت کے حامل بن گئے۔ اخبارات میں ان کے فوٹو اور انٹرویو چھپنے لگے اور ریڈیو ٹیلی ویژن پر ان کے نام آنے لگے۔ اب بتایئے وہ ایسے نفع بخش اور مفید مسئلہ کو اپنے سینے سے نہیں لگائے رکھیں گے؟

اجودھیا مارچ اور تقریبات ۲۶ جنوری کے بائیکاٹ کا اعلان انہوں نے یوں ہی بے سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کے ذریعہ ملک گیر شہرت و اہمیت کے مالک بن جائیں گے۔ اور بابری مسجد کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے سبھی مسائل یقیناً حل ہو جائیں گے۔ اور ہم دیکھتے ہی دیکھتے سیاست کے نقطۂ عروج پہ پہونچ جائیں گے ۔

جس کسی نے ان کے مذکورہ پروگراموں سے اختلاف کیا اسے منافق اور بزدل کہا گیا اور اس کے خلاف طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور اسے طعن و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا کہ یہ ہماری راہ میں روڑے کیوں اٹکا رہا ہے ؟

اور باخبر حلقے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ۱۹۸۶ء سے پہلے جب ان لیڈروں کی توجہ بابری مسجد کی طرف دلائی جاتی کہ اس کے اندر بتوں کی پوجا ۱۹۴۹ء ہی سے ہو رہی ہے اور اس کے مقدمات کورٹ میں زیرِ سماعت ہیں۔ اس لئے اس کے حل کی جانب خصوصی توجہ دی جائے تو یہی لیڈرانِ ملت بڑی بے اعتنائی سے منھ پھیر لیتے اور اسے کوئی مسئلہ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ اور آج کیوں اسے ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ

بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی راز پوشیدہ نہیں ہے؟ یقیناً ؎
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

منسٹروں سے ملاقات کی بے چینی اور ملاقات کے وقت اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا منظر دیدنی ہوتا ہے کہ کس زاویہ سے اور کس کے ساتھ ہماری اچھی تصویر آئے گی۔ اور سیاسی وصحافتی حلقوں میں ہماری اہمیت بڑھے گی۔

لیکن محمد ہاشم انصاری کو کتنے لوگ جانتے ہیں؟ جو اجودھیا کا ایک مفلوک الحال مخلص مسلمان ہے اور چالیس سال سے مقدمہ بابری مسجد لڑتے ہوئے اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ اور شاید اس کا صرف ایک جرم ہے کہ وہ ایک سیدھا سادھا درد مند مسلمان ہے جو فن لیڈری سے بالکل ناواقف ہے۔

قارئین کرام کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ ۱۹۱۹ئ میں بھی مسلمانوں کی ایک ہمہ گیر تحریک خلافت چلی تھی جو چند سال کے اندر ہی عبرت ناک ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ کیوں کہ اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں تھی۔ یہی حال بابری مسجد تحریک کا بھی ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک واضح فرق یہ ہے کہ تحریک خلافت سے ہندو مسلم تصادم کی کوئی فضا نہیں پیدا ہوئی تھی۔ جب کہ تحریک بابری مسجد جس غیر دانش مندانہ طریقہ سے چلائی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ پرست ہندو لیڈروں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست اشتعال انگیز ماحول پیدا کر دیا اور جگہ جگہ مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عزت و آبرو پر حملے کئے گئے اور ان کی مساجد کو نشانہ بنایا گیا۔ اور اڈوانی کی رتھ یاترا نے انسانی آبادیوں میں نفرت و عداوت کی ایسی بھیانک آگ لگا دی جس کے شعلے نہ جانے کب تک بھڑکتے رہیں گے۔

صرف اپنے جذبات کی تسکین اور حقیر مفادات کی تحصیل کے لئے پوری قوم کو خطرات سے دوچار کر دینا ایک ایسا سنگین مجرم ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

تقریروں کے ذریعہ جہاد کا نعرہ بلند کرنے والے لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ یہ جہاد کہاں اور کس سے اور کس طرح کیا جا رہا ہے؟ کیا ۹ر نومبر ۸۹ئ کو شیلانیاس کے موقع پر کوئی ایک بھی مجاہد اجودھیا پہنچا؟ کیا ۳۰ر اکتوبر ۹۰ئ کو جب ہزاروں ہندو ذں

نے بابری مسجد پر دھاوا بول دیا تھا تو کوئی مجاہد اجودھیا کے آس پاس بھی نظر آیا؟ اور کیا ۶ ر دسمبر ۹۰ء کو جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی تو کوئی مجاہد اجودھیا نگری تک پہنچا؟ پھر جذباتی باتیں کرنے اور غیر ضروری خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا کیا جواز اور اس کی کیا ضرورت ہے؟

جذباتی مجاہدین کا تو یہ حال ہے کہ شیلانیاس کے موقع پر بمشکل تمام دو سو افراد شہر فیض آباد میں جمع ہوئے۔ جماعت اسلامی کی بغل بچہ تنظیم ایس آئی ایم کے کچھ پُرجوش نوجوان اجودھیا لے جانے کے لئے بار بار لوگوں کو اُکسا رہے تھے۔ ایک کچھ باہوش لیڈر بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے، ان سے جب رہا نہ گیا تو انہوں نے ان نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ " ارے کم بختو! اِن بزدلوں کے چکّر میں کیوں پڑتے ہو۔ جلدی سے اجودھیا پہنچو وہاں جنت کی حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں" یہ سننا تھا کہ ان کا عارضی شوقِ شہادت رفوچکّر ہوگیا۔ اور پھر کسی نے آگے بڑھنے کا نام بھی نہیں لیا۔

خود راقم سطور سے ۵ ر دسمبر ۹۰ء کو بنارس میں کچھ نوجوان ملے۔ اور انہوں نے کہا کہ کل ۶ ر دسمبر ۹۰ء کو ہم لوگ کفن بردوش ہوکر اجودھیا جا رہے ہیں اور وہاں کارسیوکوں کو روکیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ " اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی شہادت قبول فرمائے" یہ سن کر وہ مسکراتے ہوئے خاموش ہوگئے۔ اور خاموش ہی رہے۔

اس مسئلہ کو وشو ہندو پریشد نے بڑی خوبصورتی اور حکمت عملی سے استعمال کیا۔ اس نے ہندوؤں کو یہ ذہن دیا کہ بابر جو ایک حملہ آور مغل حکمراں تھا اس نے ہماری رام جنم بھومی پہ مسجد بنوادی۔ اب ہمیں اس کا بدلہ لینا چاہئے اور رام کے نام پر کروڑوں کی لاگت سے ایک ایسا مندر تعمیر کرنا چاہئے کہ اجودھیا ہندوؤں کا شہر مقدس بن جائے اور اسے مرکزیت حاصل ہوجائے۔

اسی حکمت عملی کے تحت اس نے مختلف ہندو تنظیموں کو اکٹھا کیا اور اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس کا سیاسی فائدہ بھی اٹھایا۔ اور جگہ جگہ فتنہ و فساد کی آگ بھی بھڑکائی جس کے شکار مسلمان ہی ہوئے۔

اس کے مقابلے میں مسلم لیڈروں کا جو حال ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اخباری بیانات، قرار دادوں اور جذباتی تقریروں کے علاوہ ان کے پاس کیا ہے؟ کیا ان کے پیش نظر بھی کوئی تعمیری

منصوبہ ہے؟ ان کا حال تو یہ ہے کہ اپنے سیاسی آقاؤں کے اشارۂ ابرو پہ اپنا قدم آگے یا پیچھے بڑھاتے ہیں۔ کہ وی پی سنگھ کیا چاہتے ہیں۔ چندر شیکھر کی کیا لائن ہے۔ اور ملائم سنگھ یادو کا کیا رُجحان ہے؟ اگر ان کی خفگی کا احساس بھی ہو جائے تو یہ اپنے موقف پر نظرِ ثانی کرنے لگتے ہیں کہ آگے کے ہمارے سیاسی مفادات پر کوئی آنچ نہ آجائے۔

مذاکرات کا جہاں تک سوال ہے تو جب ہندو بابری مسجد کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہی شرعی نقطۂ نظر سے مسجد کی ایک اِنچ زمین کوئی مسلمان چھوڑ سکتا ہے۔ تو پھر اس کے کامیاب ہونے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

اجودھیا پہونچ کر بزورِ طاقت بابری مسجد پر قبضہ کرنے کے بارے میں تو اب کوئی مسلمان سوچتا بھی نہیں۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے کہ قانونی چارہ جوئی کی جاتی رہے اور اسی پر اپنا زور صرف کیا جائے۔ اور کون سی راہ باقی رہ جاتی ہے؟

ہندو مسلم فسادات ماضی میں بھی ہوتے رہے اور مستقبل میں بھی ہوتے رہیں گے، لیکن غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کون سی عقل مندی اور دانش مندی ہے؟

مسلم عوام کا یہ حال ہو چکا ہے کہ وہ ہر جذباتی نعرے کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا سیاست داں انہیں اپنے مفادات کے تحت بڑی آسانی کے ساتھ استعمال کرتے رہتے اور وہ اپنی سادہ لوحی سے کچھ سمجھ بھی نہیں پاتے۔

ایسا نہیں کہ بابری مسجد سے متعلق کئے جانے والے سبھی اقدامات غیر ضروری اور غیر مفید تھے۔ اسی طرح سبھی مسلم لیڈروں کو بھی موردِ الزام ٹھہرانا صحیح نہیں مگر حالات کچھ ایسے پیدا کر دئے گئے کہ اکثر حضرات اس کے دھارے میں بہہ گئے اور جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے تھے وہ کھل کر اپنی رائے ظاہر نہ کر سکے۔

یاد رکھئے! ”قیادت“ حالات کے دھارے میں بہنے کا نام نہیں بلکہ حالات کے دھارے کو صحیح سمت میں موڑنے کا نام قیادت ہے اور یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں، بلکہ اس کے لئے نگہ بلند اور سخن دلنواز کے ساتھ ساتھ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

(از یٰسٓ اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ جنوری فروری ۱۹۹۱ء)

مُسلم قائدین وعوام سے
ایکؔ مُخلصانہ اپیلؔ

سلام مسنون! بازیابیٔ بابری مسجد کی سرگرم تحریک اپنی ایک پنجسالہ مدت پوری کررہی ہے۔ اس درمیان ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس تحریک میں جن زعماء وقائدین نے خلوص نیت سے حصہ لیا اور مسلم عوام نے جو جانی وملی قربانی پیش کی اس کی شکرگزاری بھی ہم پر لازم ہے۔ اور مستقبل کے لئے ہمیں ایک مضبوط لائحۂ عمل بھی بنانا ہوگا۔ جس کا وقت اب ہمارے سر پہ آپہنچا ہے۔ ذیل میں راقم سطور اپنے خیالات پیش کررہا ہے۔ اور مسلم قائدین وعوام سے عرض گزار ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور اپنے تأثرات کو عملی شکل دینے کی کوشش کریں۔ یٰسٓ اختر مصباحی (۱۲/۱/۹۱ء)

مختلف حلقوں سے گفت گو یا عدالتی کارروائی کے ذریعہ بابری مسجد کے حل کے لئے متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔ لیکن وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی تنظیمیں جنہیں اپنی اکثریت پر گھمنڈ ہو چکا ہے وہ حقائق وشواہد کو پس پشت ڈال کر محض نفرت انگیز جذباتی نعروں کے سہارے ان تجاویز کو مسترد کرتی رہیں۔ اور طاقت کے بل پر بابری مسجد کو توڑ کر اس کی زمین پر مندر بنانے کے لئے اب تک یہی نعرہ لگاتی چلی آرہی ہیں کہ "مندر وہیں بنائیں گے" اور بلا جھجک یہ اعلان کرتی پھر رہی ہیں کہ "یہ تو ہندو راشٹر کی طرف ہمارا پہلا قدم ہے"۔

اپنے اسی منصوبے کے تحت انہوں نے اب تک کی ہونے والی ساری مشترکہ ملاقاتوں کو ناکام بنایا ہے۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کے کسی حل کو تسلیم نہیں کریں گی بلکہ اپنی پلاننگ کے تحت ایک کے بعد ایک نیا فتنہ بھی کھڑا کرتی جائیں گی۔ اور ان کی کوشش ہے کہ پورے ملک کے اندر پنجاب اور کشمیر جیسے حالات پیدا کر دیے جائیں۔

اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنی فراستِ مومنانہ کے ذریعہ اس نتیجہ تک پہونچ چکے ہیں کہ وہ رام کے نام پر شروع کی جانے والی تازہ ترین سازشوں کا شکار نہ ہو کر صرف اپنے مثبت تعمیری کاموں کے پیچھے اپنی ذہنی و فکری اور عملی توانائی صرف کریں اور جذباتی سیاست کے دھارے میں نہ بہیں۔

اب ہندوستان سیکولر راشٹر رہے یا فرقہ پرست عناصر اپنے شوقِ حکمرانی کی تکمیل کے لئے اسے ہندو راشٹر بنا ڈالیں، اس سے مسلمانوں کو کوئی خوف نہیں۔ اور وہ یہ حقیقت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ ان کے لئے اس ہندو راشٹر میں کوئی نئی بات نہیں ہوگی جس کا خواب ایک مدت سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور جسے خود سیکولر ہندو ہی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔

آج ہندوستانی مسلمان ہر حال میں اپنے مذہبی امتیاز و تشخص کے ساتھ اپنے وطن ہی میں رہ کر جینا اور مرنا جان چکا ہے۔ اور اس کے آئیڈیل بابر و ہمایوں جیسے سلاطین و امراء نہیں بلکہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (مہرولی، دہلی) اور حضرت نظام الدین اولیاء (دہلی) جیسے بزرگانِ دین ہیں۔ وہ اپنے سیاسی معاملات میں کسی بیرونی طاقت کا دست نگر نہیں بلکہ وہ صرف اور صرف اللہ پہ بھروسہ رکھتا ہے اور وہی اس کا حامی و ناصر ہے۔ اب ملک کے مستقبل کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اکثریتی طبقہ کے دُور اندیش افراد کو یہ سوچنا ہوگا کہ وہ اسے کس رُخ پر لے جانا چاہیں گے اور اپنے بنائے ہوئے سیکولر راشٹر کو باقی رکھنا چاہتے ہیں یا وہ اسے ہندو راشٹر کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ ملک کی تقسیم در تقسیم کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوگا۔

ایک طرف فرقہ پرست عناصر ہر حال میں بابری مسجد توڑ کر اس کی جگہ مندر بنانے ہی پر

بضد اور آمادۂ پیکار ہیں اور اکثریتی طبقہ کے سیکولر مزاج دانش ور اور سیاسی پارٹیاں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں، یا سیاسی بازیگری میں مصروف ہیں، یا خون کی ہولی کھیلنے والی ملک دشمن قوتوں کے سامنے بے بس ہو چکی ہیں۔ اور دوسری جانب اقلیتی طبقہ اپنی بہت ساری کمزوریوں کے باعث بابری مسجد کا تحفظ نہیں کر پا رہا ہے۔ تو ایسی شکل میں اب مسلمانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرتے ہوئے اس سے دعا کریں کہ پردۂ غیب سے تو ہی اس کی حفاظت فرما۔ اور ایسے حالات پیدا کر دے کہ یہ تیرا مقدس گھر تیرے عاجز اور گنہگار بندوں کے سجدوں سے آباد ہو سکے۔

ساتھ ہی آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی کے ذمہ داروں سے ہم عرض کریں گے کہ وہ مسلمانوں کے دوسرے اہم تعلیمی واقتصادی اور تعمیری مسائل کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو کسی ایسے کام میں ہرگز نہ استعمال کریں جو نہ خود ان کے لئے مفید ہو اور نہ ملک وملت کو اس سے کوئی نفع پہونچ سکے۔

اور بابری مسجد سے متعلق جو افراد قانونی سطح پر پہلے سرگرم تھے وہ دیگر مسلم تنظیموں کے اشتراک وتعاون سے قانونی چارہ جوئی کرتے رہیں۔ اور ان کے لئے عام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کام میں ان کی ضروری مدد کرتے رہیں۔

خدانخواستہ قانون وانتظام کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے شر پسند عناصر نے بابری مسجد کا ڈھانچہ منہدم کر کے اس پر مکمل قبضہ بھی کر لیا اور مسلمان اپنی کمزوری اور حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے اسے نہ بچا سکے تو اس سے نہ اسلام پر کوئی آنچ آئے گی اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ جیسا کہ ہندوستان ہی کے اندر بعض جگہوں کی ہزاروں مسجدیں جن پر غیر مسلم قابض ہیں انہیں اگر واگزار نہ کرایا جا سکا تو مسلمانوں کے ایمان واسلام اور ان کی نماز وعبادت میں کوئی خلل نہیں واقع ہو گیا۔ اور جس طرح ان ہزاروں مسجدوں پر اپنی جانب سے انہوں نے کسی کو قبضہ نہیں دیا اسی طرح بابری مسجد بھی کسی کو تحفہ یا تبادلہ کے طور پر مسلمانانِ ہند کسی قیمت پر نہیں دے سکتے۔ اور اجودھیا میں اگر مسلمان اچھی تعداد میں ہوتے تو شاید ملک کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کو تحریک چلانے کی ضرورت نہ پیش آتی اور

یہ مسئلہ خود اجودھیا ہی کے مسلمان حل کر لیتے۔ لیکن انتظامیہ اور عدلیہ کے بعض عناصر کی سازش اور جبر و اکراہ کے ذریعہ اگر اکثریتی طبقہ اس پر قبضہ کرلے جب بھی لاقانونیت اور انارکی کے اس ماحول میں قانونی اور جمہوری ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہم سے جو کچھ عملاً ممکن ہو سکے گا وہ کرتے رہیں گے۔

البتہ حکومت ہند اور مسجد کو منہدم کرنے والی پارٹیاں آپس میں یہ خوب سوچ سمجھ لیں کہ وہ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے اس غیر قانونی اور کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو چکنا چور کر دینے والے ظالمانہ فعل سے ہندوستانی دستور و آئین کا احترام کر رہے ہیں یا اسے وہ اپنے پاؤں کے نیچے روند رہے ہیں۔ اور وہ صرف ایک مسجد کی بنیاد کھود رہے ہیں یا سارے ہندوستان کی وحدت و سالمیت پر تیشہ چلا رہے ہیں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہیں۔ نیز سارے عالم اسلام اور عالم انسانیت کو برگشتہ کر کے اس کے وجود کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

اس نازک اور سنگین موقع پر دستور ہند کی وفاداری کا عہد کرنے والی سیاسی پارٹیوں بالخصوص حکمراں پارٹی کو کھل کر یہ طے کرنا ہوگا کہ اس ملک میں اب دستور و آئین اور قانون و انتظام کی بالادستی رہے گی یا زور زبردستی اور ظلم و جبر کا دور دورہ ہوگا اور اکثریتی طبقہ کے فسطائی عناصر اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہو کر اقلیتی طبقہ کے حقوق اور اس کے جذبات و احساسات کو اسی بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ پامال کرتے رہیں گے یا انصاف اور عدالت کا بھی کچھ احترام اور اس کی پاسداری کی جائے گی؟

اسی طرح ملک کے سبھی باشندوں اور تعلیمی و ثقافتی مراکز اور اصلاحی تنظیموں کو دل کی گہرائی سے یہ سوچنا ہوگا کہ نفرت و عداوت کی اس فضا میں ہماری قومی و اجتماعی زندگی کا کیا حشر ہوگا اور صدیوں سے انسانی مروت و رواداری کے ساتھ رہنے والے ہم ہندوستانیوں کے دلوں میں زہر گھولنے والے انسانیت دشمن عناصر کب تک اپنا یہ خونیں کاروبار جاری رکھیں گے؟

اور خود ہندو دھرم کے سادھو سنتوں کو اپنی ہزاروں سال پرانی تہذیب و روایت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں وہ رام عزیز ہے جسے وہ اب تک مانتے چلے آرہے ہیں اور جو گاندھی کے رام تھے یا انہیں ایڈوانی کا نیا رام چاہیے جس کے نام پر شہر شہر اور گاؤں گاؤں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ بچے یتیم کیے جا رہے ہیں۔ عورتیں بیوہ بنائی جا رہی ہیں اور ماؤں

کی گودسونی کی جارہی ہے؟ بے قصور انسانوں کو گھروں سے باہر کھینچ کر ذبح کیا جارہا ہے۔ وحشت و بربریت کے ساتھ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تڑپایا جارہا ہے، اور آگ میں جھونک کر انہیں زندہ جلایا جارہا ہے؟ کیا یہی رام بھگتی اور دیش بھگتی ہے اور کیا یہی وہ ہندو تہذیب ہے جس کا ساری دنیا میں ڈنکا پیٹا جارہا ہے۔

اضطراب و دل شکستگی کے باوجود اپنے تمام ہندوستانیوں سے ہم اپیل کریں گے کہ وہ نفرت کے بیج بونے والے مردہ ضمیر سیاست دانوں کی گھناؤنی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے جرأت و ہمت کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اپنے ملک کے اتحاد و سالمیت کا تحفظ کریں۔ اس کی تعمیر و ترقی میں نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ حصہ لیں۔ آپسی میل محبت کا خوش گوار ماحول پیدا کریں اور ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کر کے پوری دنیا میں اس کا نام روشن کریں۔

تائیدی دستخط کرنے والے علماء و ائمہ کرام

۱۔ محمد اختر رضا خاں ازہری قادری۔ نائب مفتی اعظم ہند۔ بریلی شریف۔

۲۔ سید حامد اشرف اشرفی جیلانی۔ صدر اعلیٰ مجلس انتظامیہ دار العلوم محمدیہ بمبئی۔ و خطیب و امام زکریا مسجد۔ بمبئی۔

۳۔ محمد عبد الجلیل نعیمی اشرفی۔ شیخ الحدیث دار العلوم شاہ۔ بھیونڈی۔ مہاراشٹر۔

۴۔ ظہیر الدین خاں رضوی۔ صدر المدرسین دار العلوم محمدیہ۔ بمبئی۔ و خطیب و امام مسجد اسمٰعیل حبیب بمبئی

۵۔ محمد ادریس بستوی۔ جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا کانفرنس و ناظم جامعہ اشرفیہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی۔

۶۔ عبید اللہ خاں اعظمی ایم پی۔ سکریٹری جنرل مسلم پرسنل لا کانفرنس۔

۷۔ محمد حنیف اعظمی عزیزی۔ خطیب و امام موتی مسجد۔ بائیکلہ۔ بمبئی

۸۔ توکل حسین۔ استاذ دار العلوم محمدیہ۔ بمبئی۔

۹۔ جلال الدین قادری۔ ناظم جامعہ اسلامیہ قصبہ روناہی۔ ضلع فیض آباد۔ یوپی۔

۱۰۔ عبد الرحیم فیض آبادی۔ صدر المدرسین دار العلوم محبوب سبحانی۔ کرلا۔ بمبئی۔

محمد نسیم عزیزی۔ خطیب و امام مسجد وانجہ واڑی۔ ماہم۔ بمبئی۔

۱۱۔ معین الحق علیمی۔ صدر مجلس انتظامی دار العلوم علیمیہ جمداشاہی۔ ضلع بستی۔ یوپی

۱۲۔ قمر الحسن بستوی۔ استاد دار العلوم محبوب سبحانی۔ کرلا۔ وخطیب و امام مسجد اسٹیشن

۱۳۔ روڈ۔ کرلا۔ بمبئی۔

۱۴۔ محمد شفیق الرحمن بستوی۔ نائب مفتی دار العلوم محمدیہ۔ بمبئی۔

۱۵۔ رجب علی مصباحی۔ خطیب و امام مدینہ مسجد وکرولی۔ بمبئی۔

۱۶۔ محمد اطہر علی ناظم دار العلوم محمدیہ۔ بمبئی۔

۱۷۔ محمد سعید نوری۔ سکریٹری رضا اکیڈمی۔ بمبئی۔

۱۸۔ عبد القادر رضوی۔ ناظم دار العلوم حنفیہ قلابہ بازار۔ بمبئی۔

۱۹۔ عبد الرزاق رضوی۔ ۸۳۸۔ جبل پور۔ مدھیہ پردیش۔

۲۰۔ شمس الدین مصباحی۔ استاذ دار العلوم محبوب سبحانی۔ کرلا۔ بمبئی۔

۲۱۔ اقبال احمد خاں۔ صدر انجمن تحفظ ناموس رسالت۔ کوٹھی بازار۔ گورکھپور۔ یوپی

۲۲۔ غلام محی الدین مصباحی۔ استاد دار العلوم محبوب سبحانی۔ کرلا۔ بمبئی۔

۲۰۔ کلام الدین خاں۔ خطیب و امام مسجد زکریا بندر ٹی۔ بے روڈ۔ سیوری۔ بمبئی۔

۲۱۔ محمد جلال الدین نوری مصباحی۔ خطیب و امام نئی مسجد گھوڑپ دیو۔ بمبئی۔

۲۵۔ شبیر احمد رضوی۔ مبلغ جامعہ اسلامیہ روناہی۔ ضلع فیض آباد۔ یوپی۔

۲۶/۲۷۔ عین الدین خاں رضوی و عظیم الدین اعظمی دار العلوم حنفیہ۔ قلابہ بازار۔ بمبئی۔

۲۸۔ مطیع اللہ خاں قادری رضوی۔ استاذ مدرسہ عربیہ بزم اتفاق۔ ناریل واڑی۔ بمبئی۔

۲۹۔ منور حسین بستوی۔ دار العلوم محبوب سبحانی۔ کرلا۔ بمبئی۔

جاری کردہ : فتح احمد بستوی مصباحی

ناظم نشر و اشاعت علماء اہل سنت متحدہ محاذ۔ بمبئی

(از لیٰس اختر مصباحی۔ ص ۱۰۴-۱۰۶ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ جنوری فروری ۱۹۹۱ء)

تحفظِ عبادت گاہ بِل ۱۹۹۱ء کا
خیر مقدم

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں تحفظ عبادت گاہ بِل ۱۹۹۱ء کا پارلیمنٹ کے اندر کثرتِ رائے سے پاس ہونا نہایت اہم اور خصوصی حیثیت کا حامل ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جارہا ہے۔ اور ہندوستان نیز بیرونِ ملک کے سبھی انصاف پسند عوام و خواص اسے تحسین و آفریں کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اطمینان و مسرت کی بات ہے کہ کانگریس، جنتادل، کمیونسٹ پارٹی (دونوں گروپ) اور سبھی سیکولر پارٹیوں نے اس بل کی حمایت میں اپنے ووٹ دیئے۔ اور بھارتیہ جنتا پارٹی و شیوسینا کے ناپاک عزائم کو اپنی متحدہ طاقت سے شکست فاش دے کر سرکشی و شرانگیزی کو بڑی حد تک لگام دے دیا ہے۔

بابری مسجد اجودھیا کو بھی اس بل کے اندر شامل کرلیا جاتا تو حق و انصاف کی آواز اور زیادہ مضبوط ہوتی اور ہندوستانی جمہوریت کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوجاتی، لیکن دَورِ جدید کی اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ "ووٹ کی سیاست" یہاں بھی اپنا کام کرگئی اور انگریز اپنی تاریخ گری کے ذریعہ متحدہ ہندوستان کے اندر دو بڑی قوموں کے درمیان اختلاف و انتشار کا جو پودا لگا گئے تھے اس کی جڑ اب بھی باقی رہ گئی۔ اور آگے چل کر یہ زہر آلود پودا نہ جانے کیا گل کھلائے۔ اور کیسے کیسے فتنے جنم دے۔

اس بِل کے خلاف فرقہ پرست عناصر نے جو احتجاجی بیانات دیئے، اس کی کاپیاں نذرِ آتش کیں۔ اشتعال انگیز زبانی حملے کئے۔ اور خطرناک نتائج کی جو دھمکیاں دیں وہ پارلیمنٹ سے لے کر سیاست و صحافت تک کی فضا کو مکدر کرگئیں۔ جب کہ اس کے برعکس

مسلم قائدین نے یوپی حکومت سے متعلق بعض مطالبات منوانے کے لئے ۹ ستمبر کو پارلیمنٹ کے سامنے صرف ایک دھرنا پر اکتفا کیا اور کسی قسم کے نامناسب بیان واقدام سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ اور وقتی طور پر ہی سہی مگر اس نازک موڑ پر وحدت فکر اور اتحاد عمل کا ثبوت دیا جس کی ان سے کم ہی توقع کی جا رہی تھی۔

بہرکیف! یہ صورتِ حال ایک خوشگوار تبدیلی کی علامت ہے اور اس سے اس بات کا ذہن ملتا ہے کہ اگر حقائق وشواہد کی روشنی میں سیکولر پارٹیوں کو اپنا مقدمہ سمجھا دیا جائے تو ملکی آئین اور اس کی جمہوریت کے تحفظ کے لئے وہ اس کی وکالت اور اس کے حق میں مناسب اقدام کے لئے کسی وقت بھی تیار ہو سکتی ہیں۔ اور فرقہ پرست عناصر کی سازشوں کو ناکام بنا سکتی ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ اعتدال و توازن اور معقولیت کے ساتھ اپنی ہر بات کو انصاف پسند غیر مسلم حضرات کے سامنے رکھیں اور بلا ضرورت اپنے جوش وجذبہ کے مظاہرہ سے پرہیز کریں۔

ملک و بیرونِ ملک کے سازشی عناصر آج کل سخت حیران وپریشان ہیں کہ مختلف قسم کی تدابیر اور اشتعال انگیزیوں کے باوجود اس وقت مسلم قائدین مہر بلب اور مسلم عوام خاموش تماشائی کیوں بنے ہوئے ہیں؟ اور ہمارے پُرفریب داؤ کو خاموشی کے ساتھ اُلٹ دینے کا فن انہیں کہاں سے آگیا؟ اور یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟

جنگ اور تصادم میں سارے حربے آزمائے جاتے ہیں۔ ذہن سازی، تیاری، اقدام، حملہ، دفاع، پسپائی، فتح، شکست، جنگ بندی وغیرہ کے متعدد مراحل سے ہر متحارب قوم کو گزرنا پڑتا ہے، جب جیسے حالات ہوں اپنی طاقت کے اعتبار سے ویسے ہی فیصلے لئے جاتے ہیں۔ بیان و مذمت، احتجاج ومظاہرہ، ریلی و کانفرنس کے نتیجے میں اب جبکہ مسلمان اس بل کے ذریعہ بڑی حد تک ایک جنگ جیت چکے ہیں۔ تو ان کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ صرف عدالتی کارروائی کے ذریعہ بازیابی بابری مسجد کی جنگ لڑیں اور کسی غیر ذمہ دارانہ اعلان کا شکار ہو کر سڑکوں پر آنے سے اجتناب کریں۔

ساتھ ہی ان نکات پر اہل نظر غور فرمائیں۔

۱۔ الٰہ آباد، لکھنؤ اور دہلی سے کسی کاغذی کارروائی کی تکمیل اگر کچھ دیر کے لئے اجودھیا میں ہو جائے جب بھی اس پر مسلسل عمل درآمد کے لئے مقامی مسلمانوں کا وجود اور ان کی تھوڑی بہت طاقت بھی ضروری ہے۔ اور واضح رہے کہ پانچ ہزار مندروں والے اس شہر اجودھیا میں پچاس ساٹھ ہزار کی آبادی میں بمشکل تمام پانچ چھ سو غریب و کمزور مسلمانوں کے گھر ہیں۔ جن کو شرپسند عناصر منصوبہ بند طریقہ سے پریشان کر کے وہاں سے نقلِ وطن کرنے پر مجبور کر رہے ہیں تا کہ صرف بابری مسجد نہیں بلکہ وہاں کی دسیوں آباد مساجد بھی اسی طرح ویران و غیر آباد ہو جائیں۔ اور ان کے خیالِ فاسد کے مطابق یہاں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

۲۔ مسلمان ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۱ء تک اجودھیا میں بزورِ طاقت نہ کچھ کر سکے ہیں اور نہ آئندہ کے لئے کوئی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ بیالیس سال پہلے جب مورتیاں رکھ کر بابری مسجد ہی میں ان کی پوجا شروع ہوئی تب سے شیلانیاس و کارسیوا کے تازہ المیہ تک اجودھیا کے اندر مسلمان اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکے۔ اور باہر کے مسلمان وہاں کیا پہنچیں گے؟ اور پہونچ کر بھی کیا کریں گے؟ اور اگر کچھ کر بھی لیا تو کتنے دن تک؟

۳۔ بابری مسجد ۱۹۸۶ء میں دہشت گردی کا شکار ہوئی اور ذرائع ابلاغ نے تالا کھلنے کے واقعہ کی تشہیر کی اس لئے مسلمان دیوانہ وار اس کے خلاف ہو گئے۔ اور یہی ان کی غیرتِ ملّی کا تقاضہ بھی تھا۔ ورنہ پنجاب وغیرہ میں اب بھی ہزاروں مساجد غیر آباد اور غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں اور ظاہر ہے کہ بابری مسجد کا تقدس و احترام بھی اتنا ہی ہے جتنا دوسری مقبوضہ مساجد کا۔

۴۔ فرقہ پرست عناصر اپنے شرپسندانہ اقدامات سے پولیس و انتظامیہ اور حکومتِ وقت سے چھیڑ چھاڑ کریں گے تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتیں گے جیسا کہ اس سے پہلے کارسیوا کے موقع پر اجودھیا ہی میں سب کچھ ہو چکا ہے۔

۵۔ رام جنم بھومی کا نعرہ لگا کر وشو ہندو پریشد ہندوؤں کے جذبات سے جس طرح کھیل رہی ہے اس کے غبارے سے مسلمانوں کی خاموش حکمتِ عملی جلد ہی ساری ہوا نکال دے گی اور وہ حساب و کتاب اور اختیار و اقتدار کے چکر میں باہم دست بگریباں نظر آئے گی۔

۶۔ "ہندو راشٹر" کا زور بھی اسی طرح ختم ہو سکے گا۔ اور لکھنؤ سے آگے بڑھ کر دلّی پر راج کرنے کا بی جے پی پلان بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

(از یٰسٓ اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء)

تحفظ بابری مسجد کی سرگرم کوششیں

یکم فروری ۱۹۸۶ء سے آج تک کی تحفظ بابری مسجد کی تاریخ مسلمانانِ ہند کی بہت سی جانی و مالی قربانیوں پر مشتمل ہے۔ اور انہوں نے پوری طاقت و توانائی کے ساتھ بابری مسجد پر ہونے والے حملوں کا دفاع کیا ہے۔ مجموعی طور پر عوام و خواص دونوں کی مخلصانہ قربانیاں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اور ادھر تقریباً سال بھر سے انہوں نے جس حکمت و دانائی اور فہم و فراست مومنانہ کا ثبوت دیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف و ستائش کی جائے وہ کم ہے۔ آئینی و قانونی جنگ ہی مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید بھی ہے۔

لیکن اس تحریک کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ اپنی سیاست و شہرت کی خاطر بعض معروف مسلم لیڈروں نے مسلم جذبات کا استحصال کرتے ہوئے اجودھیا مارچ اور تقریبات ۲۶ جنوری کے بائیکاٹ جیسا غیر دانش مندانہ اور نقصان دہ نعرہ لگا کر مسلم عوام کو سڑکوں پر لا کھڑا کر دیا اور اپنے سیاسی قد و قامت کو بلند کرنے کے لئے اشتعال انگیز بیانات اور قراردادوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ جس نے پوری مسلم قوم کو شدید اضطراب دے دیے چینی اور طرح طرح کی مشکلات و خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔

حالات کے تیور بتا رہے ہیں کہ امریکہ کی سی آئی اے۔ اسرائیل کی موساد اور بھارت کی آر ایس ایس کے درمیان کوئی نہ کوئی خفیہ معاہدہ ضرور ہو چکا ہے جس کے ذریعہ وہ پورے ہندوستان کے اندر ہندو مسلم ٹکراؤ کا ماحول پیدا کر کے اپنی سیاسی فضا ہموار کریں اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو رفتہ رفتہ دلی کے تخت و تاج کا مالک بنا دیں۔ گویا وہ اپنے منصوبہ کے مطابق اپنی سازش کا بیج بو چکے ہیں جس کا پودا اُگ کر لہلہا رہا ہے۔ اب صرف اس کے پکنے اور مناسب موقع پر فصل کاٹنے کا انتظار ہے۔

بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی بھرپور کوشش ہے کہ سیاسی

اور تکنیکی طور پر اپنے مکروہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ ہندو عوام کے دلوں میں نفرت کا یہ زہر بھر دیں کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کر کے ان کے دھرم ان کی تہذیب اور ان کے رسم و رواج کو بدل ڈالنے کی لگاتار جدوجہد کی ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کو جگہ جگہ مسمار کر کے ان پر اپنی مسجدیں بنا ڈالی ہیں۔ ان کے اندر ہندوستان سے وفاداری کا کوئی جذبہ نہیں۔ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان بنا لینے کے بعد اب وہ پاکستان ہی کو اپنا مرکز امید اور مضبوط قلعہ سمجھتے ہیں۔ اور ان کا ہر قدم بھارتی مفادات کو ضرب پہنچانے کے لئے اٹھتا ہے۔

ایسے نازک موقع پر ہماری دُور اندیشی کا تقاضا ہے کہ انتہا پسند ہندو عناصر کی سازشوں کا شکار ہونے کی بجائے ان کی سازشوں کو اپنی حکمتِ عملی سے ناکام بنا کر اپنی فراستِ مومنانہ کا ثبوت دیں اور کمال دانشمندی کے ساتھ ان کی خفیہ تدبیروں کو اُلٹ کر ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو روک دیں۔ اور ان کی جارحانہ فرقہ پرستی کو عریاں کر کے ہندوستانی عوام کے سامنے انہیں بساطِ سیاست کے پِٹے ہوئے مہرے بنا ڈالیں۔

بابری مسجد کا مسئلہ اتنا حساس ہے کہ کانگریس، جنتا دل اور سماج وادی جنتا دل کی حکومتیں اپنی غیر واضح اور مذبذب پالیسی کی بنا پر سیاسی اقتدار سے محروم ہو چکی ہیں۔ اب پھر کانگریس برسرِ اقتدار ہے۔ موجودہ وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ نے ۱۵ اگست ۹۲ء کو لال قلعہ کی فصیل سے بابری مسجد کے تحفظ کا جو اعلان کیا ہے۔ اس پر مثبت اور منفی ہر طرح کا ردِ عمل سامنے آ رہا ہے۔ مسلم علماء و قائدین اور سادھو سنتوں سے اگست ۹۲ء اور ستمبر ۹۲ء میں بیچاسوں ملاقاتیں وزیر اعظم خود کر چکے ہیں۔ اور مسٹر چندر شیکھر کے دَور میں جس طرح فریقین کے ذمہ داروں کے درمیان مذاکرات ہو چکے ہیں اسی طرز پر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں دوبارہ مذاکرات کا آغاز ہو چکا ہے، ہندوستانی عوام کی خواہش تو یہی ہے کہ مذاکرات کسی ایسے حل کا پیش خیمہ بن جائیں جو فریقین کے لئے قابلِ قبول ہو مگر کچھ ایسے مفاد پرست سیاسی عناصر بھی ہیں جو ان مذاکرات کو کسی بھی قیمت پر کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہیں گے۔ اس مسئلہ کو زندہ اور جاندار بنا ہی ان کی سیاست و شہرت کے لئے ضروری ہے۔ اور ایسا لگتا

ہے کہ دلّی پر حکمرانی کا خواب دیکھنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی بھی خانہ ساز حیلوں اور بہانوں کی بنیاد پر مسئلہ اجودھیا کو زندہ اور باقی رکھنا چاہتی ہے۔ اس لئے ان مذاکرات کے نتائج کے سلسلے میں زیادہ پُر امید ہونا بھی ایک طرح کی خوش فہمی اور شاید خود فریبی ہی ہوگی تاہم۔ ع دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

۸ رجولائی ۱۹۹۲ء کو سلطان صلاح الدین اویسی ایم۔پی چیرمین آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی رہائش گاہ (۴۴۔ اشوک روڈ۔ نئی دہلی) پر ایکشن کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میٹنگ کے بعد ایک وفد کی شکل میں اسی روز وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ سے ملاقات بھی ہوئی جس نے بابری مسجد کے تعلق سے اپنے موقف کو واضح کیا۔ صلاح الدین اویسی ایم پی، ظفر یاب جیلانی، جاوید جبیب اور لیٰسؔ اختر مصباحی وفد میں شامل تھے۔

۲۷ رجولائی ۹۲ء کو بھی اویسی صاحب کی رہائش گاہ پر ہونے والی ایک میٹنگ کے بعد ظفر یاب جیلانی، جاوید جبیب اور لیٰسؔ اختر مصباحی کی وزیر اعظم سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی۔

وزیر اعظم کی خصوصی دعوت پر علامہ ارشد القادری اور لیٰسؔ اختر مصباحی کی ان سے اگست ۹۲ء اور ستمبر ۹۲ء میں تین ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ۱۰ راگست۔ ۲۴ راگست اور ۷ رستمبر کو ہونے والی یہ ملاقاتیں اس اعتبار سے بے حد اہم ہیں کہ پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ ہم نے وزیر اعظم کو مسلمانانِ ہند کا یہ موقف بتلا دیا کہ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ ۲۲ ردسمبر ۱۹۴۹ء سے پہلے کی پوزیشن میں لاکر بابری مسجد مسلمانوں کے مکمل اختیار و تصرف میں دی جائے۔ یہ حل اگر منظور ہے تو دوسرے متعلقہ مسائل کے بارے میں شرعی حدود کے اندر علماء کرام سے تبادلۂ خیال کے بعد کوئی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اور آپ کی خواہش کے مطابق اس مسئلہ کے عملی حل کے لئے ہم آپ کی جائز مدد بھی کرسکتے ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ مسلم پرسنل لا کی تحریک کو مسلمانانِ ہند کے درمیان عام کرکے حکومتِ ہند کو پارلیمنٹ کے اندر ایک بل لانے کے سلسلے میں کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس نے بڑا اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں علمائے اہل سنت نے

نے اپنی تقاریر و بیانات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر ایک نئی رُوح پھونک دی تھی۔ بمبئی، کلکتہ، کانپور، ناگپور وغیرہ میں بے شمار جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ خاں اعظمی کی شعلہ بار خطابت نے پورے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔ مولانا محمد ادریس بستوی کو اسی طرح کی تقاریر کے نتیجہ میں ۱۹۸۶ء ہی میں ایک بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں علامہ ارشد القادری کی قیادت میں سیوان بہار کے اندر عظیم الشان اور تاریخ ساز مسلم پرسنل لار کانفرنس ہوئی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ کے اندر مسلم پرسنل لار اور بابری مسجد کے تحفظ کے لئے تین سو تیرہ علمار و مجاہدین نے مسلم پرسنل لار کانفرنس کے پلیٹ فارم سے گرفتاری دی۔ مسلم پرسنل لار کانفرنس کے وفد کی سابق وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی۔ سابق وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور مسٹر نرائن دت تیواری وغیرہ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ علامہ ارشد القادری، مولانا عبید اللہ خاں اعظمی اور لیس اختر مصباحی نے اپنی ملاقاتوں میں ان حضرات کو مسلمانانِ ہند کے موقف سے بار بار آگاہ کیا تھا۔ اور اس قابل رشک کامیابی کا تو کوئی جواب نہیں کہ حاجی عبد الغفار نوری اندوری و مفتی حبیب یار خاں نوری اندوری کی کوششوں سے شاہ بانو نے اپنا توبہ نامہ شائع کرایا جس کا ذکر خود اس توبہ نامہ میں بھی ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ دونوں حضرات مفتی اعظم حضرت مولانا مصطفےٰ رضا قادری نوری بریلوی قدس سرہٗ کے مرید اور خلیفہ بھی ہیں۔ مولانا سید محمد ہاشمی میاں کچھوچھوی اور مولانا ظہیر الدین خاں رضوی و دیگر علمار اہل سنت نے بمبئی وغیرہ میں جو خدمات انجام دیں انہیں کون فراموش کر سکتا ہے۔

مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی ایکشن کمیٹی کے چیرمین، مولانا محمد ادریس بستوی جوائنٹ کنوینر اور مولانا محمد لیٰسؔ عثمانی بدایونی سرگرم ممبر ہیں۔ یوپی کے اندر ضلعی و شہری سطح پر جو لوگ بابری مسجد کے تعلق سے سرگرم ہیں ان میں سے بیشتر حضرات اہل سنت و جماعت ہی کے افراد ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ ہماری کچھ غفلتوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ملی و قومی سطح پر ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہ مفاد پرست علمار قیادت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں جنہیں کانگریس نے

اپنی کانگریسی کے لیے اب تک پال رکھا ہے۔ اور وہ اتنے تنگ نظر ہو چکے ہیں کہ علماء اہل سنت کی کوئی پیش قدمی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چنانچہ مولانا احمد علی قاسمی جنرل سکریٹری مسلم مجلس مشاورت کا یہ ایک تازہ ترین انٹرویو ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا وزیر اعظم آپ لوگوں کے علاوہ بھی کچھ لیڈروں سے مل کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

جواب: ہاں! وہ جاوید حبیب کی وساطت سے بریلوی علماء کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ بات کس مرحلہ میں ہے، نہیں بتا سکتے، لیکن گفتگو چل رہی ہے۔ دوسری کوشش شیعہ علماء سے ہو رہی ہے لیکن اب تک شیعہ علماء کا رویہ ہم لوگوں کے حق میں ہے۔ حالاں کہ ان لوگوں سے خطرہ زیادہ تھا لیکن ان کا رول صحیح ہے۔

(ص ۹۔ ہفت روزہ ہمارا قدم نئی دہلی۔ یکم اکتوبر تا ۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

اس سوال وجواب کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وزیر اعظم اپنے پروگرام کے مطابق دیوبندی علماء، بریلوی علماء اور شیعہ علماء سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اصل اور صحیح نمائندگانِ مسلمین تو دیوبندی علماء ہیں۔ لیکن دو طبقے اور بھی ہیں بریلوی اور شیعہ۔ ان میں شیعہ علماء سے زیادہ خطرہ تھا لیکن ان کا رول صحیح ہے۔ اور یہ خطرہ بریلوی علماء سے زیادہ پیدا ہو گیا ہے کیوں کہ وزیر اعظم انہیں ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مسلم مجلس مشاورت کے آفس سکریٹری سے جنرل سکریٹری بن جانے والے مولانا احمد علی قاسمی کے ان فاسد خیالات کی عمارت بھی کتنی کمزور بنیاد پر کھڑی ہوئی ہے کہ "مگر وہ بات کس مرحلہ میں ہے نہیں بتا سکتے"۔ یعنی ان حضرت قاسمی کو اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ کیا بات ہو رہی ہے اور کس مرحلہ تک پہونچی ہوئی ہے مگر فیصلہ یہ صادر فرما رہے ہیں کہ وزیر اعظم "بریلوی علماء کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

بدگمانی کے یہ جراثیم بلاوجہ نہیں ہوئے ہیں۔ بات انہوں نے "بریلوی علماء" سے شروع کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی متعصب مولوی یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ بریلوی علماء وزیر اعظم سے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ ملاقات کریں؟

یہ حقیقت کسے نہیں معلوم کہ مولانا احمد علی قاسمی جمعیۃ العلماء کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں
جس کے اکابر تقسیم ہند کے بعد عالم عرب میں اس خدمت پر مامور ہوا کرتے تھے کہ وہ بااثر
شخصیات اور شیوخ و علماء سے ملاقاتیں کرکے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے مطمئن کریں۔
اور انہیں بتلائیں کہ ہندوستان میں "سب خیریت ہے"۔

اور شاید مولانا احمد علی قاسمی کو یہ یاد نہیں رہا کہ شیلا نیاس کے بعد سرکاری تحویل میں
لے کر انہیں اجودھیا بھیجا گیا تھا۔ اور واپس آکر انہوں نے پوری ڈھٹائی سے بیان دیا تھا کہ
وہاں "سب خیریت ہے" اور پھر دلی کے مسلمانوں کے خوف سے وہ ایک عرصہ تک فرار
اور روپوش رہے۔ سے

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلقِ سلیماں چادرِ زہرا

مسلم پرسنل لار کانفرنس نے اپنی مختصری تاریخ میں حق گوئی کا جو فریضہ انجام دیا ہے
اس کی موجودہ ملی تنظیموں کے اندر مشکل ہی سے کوئی مثال مل پائے گی۔ چنانچہ شاہ بانو کیس میں
پارلیمنٹ میں جب بل پاس ہوا تو اس کے اندر پائے جانے والے شرعی نقص کے خلاف مسلم پرسنل لار
کانفرنس نے ایک پوسٹر دلی کے اندر تقسیم کرایا اور اسے دیواروں پر چسپاں بھی کرا دیا گیا تھا جس
کے نتیجہ میں مسلم پرسنل لار بورڈ کی مبارکبادی کا سلسلہ یکلخت رک گیا۔ علامہ ارشد القادری
نے اپنے مضامین کے ذریعہ اس کی خامیوں کی نشاندہی فرمائی۔ اور روزنامہ آزاد ہند کلکتہ وغیرہ
نے مسلم پرسنل لار کانفرنس کے تائیدی حوالہ سے اختلافی اداریے بھی لکھے۔

ابھی مئی ۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ کے اندر م۔ افضل ایڈیٹر ہفت روزہ اخبارِ نو دہلی و ممبر پارلیمنٹ
کی تقریر کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں جو اخبارِ نو کے شمارہ جون ۹۲ء سے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

محترم وائس چیرمین صاحب! میں سیتارام کیسری صاحب اور مرکزی حکومت کو مبارکباد
دینے سے پہلے اس ریاست کے وزیرِ اعلیٰ کو مبارکباد دینا چاہوں گا جس نے ہندوستان میں
سب سے پہلے اپنی ریاست کے اندر اقلیتوں کے کمیشن کو قانونی درجہ دیا اور وہ ریاست
ہے بہار، جہاں پر لالو پرشاد یادو نے ۳ر اگست ۱۹۹۱ء کو اقلیتوں کے کمیشن کو قانونی درجہ دیا۔

میں مرکزی حکومت کو بھی اس بات کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں خصوصاً سیتارام کیسری صاحب کو جو یہ بل لے کر آئے ہیں، لیکن ان کے لئے مبارکباد آدھے دل سے ہے۔ آدھے دل سے میں یہ مبارک باد دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سیتارام کیسری ایک بہت ہی اچھا بل لانا چاہتے تھے، لیکن جب بل ہمارے سامنے آیا تو اس میں وہ بات نظر نہیں آئی۔ اس میں سیتارام کیسری صاحب کے جذبات نظر نہیں آئے۔ اس بل میں بہت ساری یکساں ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ یہ بل اس طرح سے لایا گیا ہے جیسے شاہ بانو کیس کے اندر مسلم ویمن بل آپ لائے تھے اور اس کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کانفرنس نے کہا تھا کہ یہ لولا لنگڑا بل لے کر آئے ہیں اور اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہونے جا رہا ہے جو اس وقت صحیح معنوں میں مطالبہ تھا۔ میں اس وقت بھی یہی کہوں گا کہ یہ بل اس حیثیت سے نہیں آیا ہے جس حیثیت میں اس کو آنا چاہیے تھا۔ یہ میری نظر میں ایک کمزور بل ہے۔ میں اس کو لولا لنگڑا تو بالکل نہیں کہوں گا لیکن یہ میرے نزدیک کمزور بل ہے جو بہت زیادہ اختیارات کمیشن کو نہیں دیتا ہے۔ قانونی پابندیاں اس کی بہت کمزور ہیں۔

(اقلیتی کمیشن پر راجیہ سبھا میں ایم۔ افضل کی تقریر۔ مئی ۹۲ء)

۱۵ر جولائی (۱۹۹۲ء) کو جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم پی، صدر انڈین یونین مسلم لیگ کی رہائش گاہ (۷، بلونت رائے مہتہ لین۔ نئی دہلی) پر ایک بے حد اہم اور نمائندہ میٹنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کے ہر سیاسی و مذہبی گروپ کے ممتاز حضرات شریک تھے۔ آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی میں اتحاد کے سلسلے میں یہ میٹنگ بلائی گئی تھی۔ باضابطہ مدعوئین میں مولانا عبیداللہ خاں اعظمی اور رئیس اختر مصباحی بھی تھے۔

اس میٹنگ میں کافی بحث و تمحیص کے بعد آخر میں یہ طے پایا کہ چند نمائندہ افراد کی دوسری میٹنگ کل ۱۶ر جولائی کو سلطان صلاح الدین اویسی ایم پی کی رہائش گاہ پر رکھی جائے اور وہیں کوئی فیصلہ کر لیا جائے۔

۱۶ر جولائی کو سلطان صلاح الدین اویسی ایم پی کی رہائش گاہ پر جو میٹنگ ہوئی اس کے شرکاء یہ تھے۔ سلطان صلاح الدین اویسی ایم پی، صدر مجلس اتحاد المسلمین۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم پی صدر مسلم لیگ۔ سید شہاب الدین ایم پی کنوینر بابری مسجد رابطہ کمیٹی۔ سیف الدین سوز ایم پی۔

نینل کانفرنس۔ جاوید حبیب ترجمان ایکشن کمیٹی۔ مولانا سراج الحسن امیر دعوتِ اسلامی، قاضی مجاہدالاسلام قاسمی۔ مولانا اسرارالحق قاسمی سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند۔ مولانا شفیع مونس، یٰس اختر مصباحی نائب صدر مسلم پرسنل لاء کانفرنس۔

اضطراب و بے چینی کا سلسلہ خصوصیت کے ساتھ ۱۶ر جولائی کی مذکورہ اہم میٹنگ سے شروع ہوا اور پھر وزیر اعظم سے ہماری کئی ملاقاتوں کی خبر نے بہت سے پرانے ٹھیکیداروں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اور ان کی اندرونِ خانہ سازشوں کا جال تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ ہم بھی کمربستہ ہیں اور ان کی سازش کو انشاء اللہ ناکام بنانے کا اپنے اندر حوصلہ اور صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں سیاسی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ عوامی اور افرادی قوت میں ہم ان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ جس کے ذریعہ ہم بابری مسجد کا بھی تحفظ کریں گے اور اہل سنت کے وقار کا بھی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(از یٰس اختر مصباحی۔ اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ نومبر ۹۲ء)
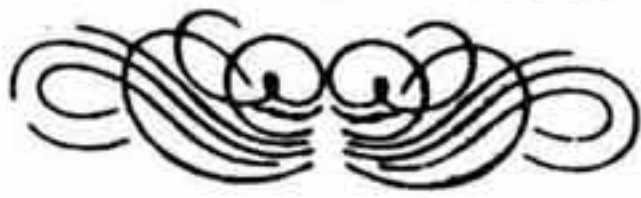
علماء وقائدین کے کچھ بیانات ومطالبات

بابری مسجد کی عہد بہ عہد داستان
تاریخی حقائق کی روشنی میں

دسمبر ۱۹۴۹ء سے دسمبر ۱۹۹۲ء تک
اہم حالات وواقعات

بابری مسجد اور دیگر مقبوضہ مساجد کی

بازیابی کا مُطالبہ

بابری مسجد اجودھیا کے تنازعہ کے پس منظر میں جو بات سب سے زیادہ قابل مبارک باد رہی ہے وہ ہے مسلمانوں کا صبر اور نظم و ضبط ا گزشتہ ۴۰ سال سے مسلمانوں نے جس طرح اس معاملے میں اپنے پائے استقامت کو ڈگمگانے نہیں دیا۔ وہ ان کی اس اسلامی تعلیم کا نتیجہ ہے جو انہیں حالات کا باوقار انداز میں صبر و ضبط سے مقابلہ کرنے درس دیتی ہے۔ انہوں لانے اس مسئلہ میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے نہ کوئی رتھ یاترا نکالی ہے اور نہ ہی کوئی تالہ توڑ تحریک چلائی۔ بلکہ ہر ہر قدم پر ملک کے آئین، قانون اور کورٹ کا احترام کیا ہے۔

آج جب کہ زیریں عدالت نے بابری مسجد کے تالا توڑنے اور اس میں پوجا کرنے کی اجازت دے دی ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، لیکن ان کو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آئینی اور قانونی جدوجہد کے راستے بند نہیں ہوئے ہیں۔ یہ فیصلہ یقیناً عدالت بالا میں چیلنج کیا جائے گا۔ اور فوری طور پر کرنے کی بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو عدالت بالا میں اٹھائے جانے کا اہتمام کیا جائے اور مسلم ماہرین قانون عملی طور پر اس کے لیے متحرک ہو جائیں اور تدبر و دانش مندی کے ساتھ اسے آگے بڑھائیں۔

حکومت ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور ان کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے بابری مسجد اجودھیا کو ان کے حوالے کرے اور اس میں انہیں نماز ادا کرنے کی باضابطہ اجازت دے۔

اسی طرح دہلی، ہریانہ، راجستھان، پنجاب وغیرہ کی جو مساجد غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں انہیں مسلمانوں کے حوالہ کرے۔ اور محکمہ آثار قدیمہ کی ساری مساجد کے دروازے پنج وقتہ نماز باجماعت کے لیے کھول دے۔

لیس اختر مصباحی، نائب صدر کل ہند مسلم پرسنل لاء کانفرنس

(ص ۱۴۔ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ ۲۵ر فروری تا ۳ر مارچ ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد کی بازیابی کی جدّوجہد

بابری مسجد کا قصہ خوں ناب سننے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں جمہوری حکومت ہے اور حکومت کی بنیاد انصاف اور مساوات پر ہے۔ سوچا نہیں جا سکتا کہ کسی ملک کی عدلیہ اور انتظامیہ امن وانصاف کے خلاف ایسا زبردست ڈرامہ اسٹیج کر سکتی ہے۔ لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ اب کیا ہوگا کیوں کہ سوال اب صرف ایک مسجد کا نہیں ہے بلکہ اس اعتماد کا ہے جو اجتماعی زندگی کی ضمانت ہے۔ جب محافظ ہی قاتلوں کی کمان سنبھال لیں تو اب جان کی حفاظت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ مصائب ومشکلات کی دبیز تاریکیوں میں اب سوائے اس کے ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے کہ ہم ضمیر کے تہہ خانے میں رہنے والی ایمانی قوت کو جگائیں اور رات کی تاریکیوں میں اس خدائے جبار وقہار کے آگے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں جس نے ہاتھیوں کے سیاہ لشکر کو ناچیز پرندوں کے ذریعہ آن واحد میں ہلاک کر دیا۔ اس نے خانہ کعبہ کی چھت پر اڑنے والے پرندوں سے وہ کام لے لیا جو کام آج عذاب نازل کرنے والے بمبار طیاروں سے لیا جاتا ہے۔ انتظار کیجیے غیرتِ الٰہی جس دن حرکت میں آگئی اس دن سارے اصنام منہ کے بل گر جائیں گے۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں ہر کوشش کے ساتھ نتیجہ کا ربط اور ہر نتیجے کے پیچھے کوشش کا تعلق فطرت کا ایک جانا پہچانا قانون ہے۔ اس لیے ہمیں پوری ہوشمندی کے ساتھ بابری مسجد کی بازیابی کی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ مسلم پرسنل لاء کی لڑائی جس والہانہ جذبے کے ساتھ ہم نے سر کی ہے اخلاص اور اعتماد علی اللہ کی قوتیں اسی طرح اگر شاملِ حال رہیں تو اس جنگ میں بھی ہمیں کامیابی نصیب ہوگی۔

لیکن قدم قدم پر یہ نکتہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مسلم پرسنل لاء کی لڑائی ملک کے کسی فرقہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ سرتاسر حکومت کے خلاف تھی۔ سیوان سے لے کر دہلی تک ہماری سرفروشیوں کی ساری کہانی اس حقیقت کے گرد گھومتی ہے۔

لیکن بابری مسجد کا قضیہ حکومت سے بھی تعلق رکھتا ہے اور ملک کی اکثریت سے بھی۔ اس لئے عقل اور سلامت روی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہماری تحریک میں کسی گوشہ سے بھی فرقہ وارانہ اشتعال کو پنپنے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔ زمانہ کی اس بوالعجبی کو کیا کہا جائے کہ اینٹ اور پتھر کی جو عمارت ساڑھے چار سو سال تک مسجد کی حیثیت سے ہمارے استعمال میں رہی اب اس کو مسجد ثابت کرنے کے لئے ہمیں الٰہ آباد ہائی کورٹ جانا پڑ رہا ہے۔ کاش اجودھیا کے بتوں کو بولنے والی زبان مل جاتی تو ہمیں دستاویزات پیش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ وہ خود گواہی دیتے کہ ساڑھے چار سو سال تک اللہ اکبر کی صداؤں سے ان کا عالم کس طرح زیر وزبر ہوتا رہا ہے۔

ارشد القادری، صدر کل ہند مسلم پرسنل لاء کانفرنس

(ص ۷۱ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ اگست ۱۹۸۸ء۔ یکم فروری ۱۹۸۶ء میں شہادت بابری مسجد کے فوراً بعد مندرجہ بالا بیان متعدد اخبارات میں شائع ہوا)

اجودھیا مارچ کے اثرات ونتائج

اخبارات کے بیان کے مطابق بابری مسجد کی طرف پیش قدمی (اجودھیا مارچ) کے لیے ۱۴ اکتوبر ۸۸ء کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔

اگر یہ سیاسی نوعیت کا کوئی ڈرامہ ہے تو ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔ اور اگر اسلام اور مسلمانوں کے نام پر سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا ہے تو چند نکات پر ذمہ داران کل ہند مسلم پرسنل لار کانفرنس اپنی تشفی چاہتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں بابری مسجد کی طرف پیش قدمی (اجودھیا مارچ) کالازمی نتیجہ تصادم ہے۔ ہندو اکثریت کے ساتھ ہو یا فوج اور پولیس کے ساتھ، دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے تحفظ اور بعد کے حالات پر قابو پانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے جانی ومالی نقصانات کے بعد بھی کیا اس پیش قدمی سے بابری مسجد کی واپسی متیقن ہے؟ جب کہ موجودہ حالات میں بظاہر اس کے قریب پہونچنے کی بھی کوئی توقع نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ بنارس کی گیان باپی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ دونوں کا ماحول اس وقت بالکل پُرسکون ہے۔ وہاں معمول کے مطابق نمازوں کا سلسلہ اور نمازیوں کی آمدورفت بھی بے خوف وخطر جاری ہے۔ اگر بابری مسجد کی طرف پیش قدمی (اجودھیا مارچ) کے جواب میں خدانخواستہ فرقہ پرست ہندو تنظیموں نے بھی مذکورہ بالا دونوں مسجدوں کی طرف پیش قدمی کا پروگرام بنالیا تو ان حالات میں جن مشکلات کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا اور جن مصائب سے ہمیں دوچار ہونا پڑے گا ان کا حل بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے پاس کیا ہے؟

مثال کے طور پر:۔

(الف) فرقہ پرست ہندو تنظیموں کی پیش قدمیوں کو روکنے کے لئے ہمارے پاس کیا وسائل وذرائع ہیں؟

(ب) اگر ہندو ان دونوں مسجدوں تک پہونچنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے دونوں مسجدوں کے گرد گھیرا ڈال دیا تو اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا نکلے گا کہ بابری مسجد کی طرح فرقہ وارانہ تصادم کا سوال پیدا کر کے حکومت نمازیوں کی آمد ورفت پر پابندی عائد کر دے گی اور اس کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ ان مسجدوں کا ماحول اعتدال پر آسکے گا یا خدانخواستہ بابری مسجد ہی کی طرح ان دونوں مسجدوں کے لئے بھی ہمیں ایک نیا محاذ جنگ کھولنا پڑے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بابری مسجد کی طرف پیش قدمی (اجودھیا مارچ) کی تاریخیں جتنی قریب آتی جائیں گی ملک کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور اشتعال انگیزی کا بخار تیز ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جن راستوں سے پیش قدمی کرنے والوں کا قافلہ گزرے گا وہاں کی ساری ہندو آبادی راستہ روکنے کے لئے سڑکوں پر کھڑی ہو جائے گی۔ اس طرح کئی ہزار مربع میل کے علاقے میں ہندو مسلم فسادات کا خطرہ بالکل یقینی ہو جائے گا اور ملک کے طول وعرض میں فساد کی آگ بھڑک سکتی ہے۔

ان حالات میں ہم صرف اتنا معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ بابری مسجد رابطہ کمیٹی نے پروگرام طے کرنے سے پہلے مذکورہ بالا خطرات کو اپنی نظر میں رکھا یا نہیں؟

اگر رکھا ہے تو ہمیں مطمئن کیا جائے کہ ان کے اس انتہا پسندانہ اقدام کے نتیجے میں ہماری محفوظ مسجدوں کو نہ کوئی نیا خطرہ پیش آئے گا اور نہ فرقہ وارانہ فساد کی آگ کہیں بھڑکے گی۔

اور اگر ان یقینی خطرات کی طرف سے وہ ہمیں مطمئن نہیں کر سکتے تو غیر منظم اور نہتے مسلمانوں کو اپنے سیاسی میدان جہاد میں اتارنے والے لیڈر خودکشی اور اسلامی جہاد کا فرق محسوس کریں اور اس پر بھی نظر رکھیں کہ جہاد کے لئے اسلام نے جو شرائط مقرر کئے ہیں وہ پائے جاتے ہیں یا نہیں؟

امرتسر کی مثال ابھی بالکل تازہ ہے کہ فوج نے ایک مسلح قوم کو کس طرح توڑ کر رکھ دیا ہے۔

ایسی صورت میں اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا جب سڑکوں پر فوج اور پولیس کے ساتھ تصادم ہوگا اور آبادیوں میں فرقہ پرست قوتوں کے ساتھ۔

اب جہاں تک بابری مسجد کی بازیابی کا سوال ہے تو اس کے لیے صرف ایک ہی محفوظ و پُر امن راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلم رائے عامہ کی ساری قوت فقط اس مطالبہ پر صرف کریں کہ اس مسجد کے استحقاق کا فیصلہ کرنے کے لئے حکومت ایک اسپیشل بنچ قائم کرے اور مقدمہ کی سماعت کے لئے جنوبی ہند کے کسی جج کو مقرر کرے۔ ہمارے پاس اپنے استحقاق کے اتنے تاریخی و قانونی دلائل و شواہد ہیں کہ خدا کے فضل و کرم سے فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور رام جنم بھومی کا دعویٰ ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا جس کے بعد قانون کی نظر میں بھی بابری مسجد کی یہ پوزیشن بالکل واضح ہو جائے گی کہ وہ صرف بابری مسجد ہے رام جنم بھومی نہیں ہے اور پھر ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی رائے عامہ ہمارے ساتھ ہوگی۔

اور یہ راستہ ہمیں اس لئے اختیار کرنا چاہیے کہ اس کے سوا بابری مسجد کی بازیابی کا بظاہر کوئی راستہ نہیں اور ہمیں اپنے آئینی و اخلاقی حدود اور اسلامی قواعد و ضوابط کے مطابق ہی سارے اقدامات کرنے چاہئیں۔

بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے قائدین اگر مسلمانوں کے صحیح معنوں میں خیر خواہ ہیں تو میرٹھ، ملیانہ اور ہاشم پورہ کے بعد انہیں مسلمانوں کو اجودھیا کے نئے مقتل میں ہرگز نہیں لے جانا چاہیئے۔ دفاعی، تنظیمی اور مالی وسائل سے محروم ایک قوم کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کا یہ انداز انتہائی افسوسناک اور تباہ کن ہے۔

ارشد القادری
صدر کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس

یٰسٓ اختر مصباحی
نائب صدر کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس

مورخہ ۸ر جون ۱۹۸۸ء

(ص ۵۔ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ ۱۷ تا ۲۳ر جون ۱۹۸۸ء)

(ص ۸۔ ہفت روزہ اخبار نو دہلی۔ ۲۴ تا ۳۰ر جون ۱۹۸۸ء)

بابری مسجد اور مسلمانانِ ہند

مسلمانانِ ہند اپنا یہ موقف بار بار واضح کر چکے ہیں کہ وہ بابری مسجد یا کسی بھی مسجد کا کوئی حصہ نہ منتقل کر سکتے ہیں نہ ہی اس سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ اور اگر کسی مسجد یا اس کے کسی حصہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا جائے جب بھی وہ اس پر رضامندی کی مہر کسی حال میں ثبت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی بازیابی کی آئینی و دستوری جدوجہد ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

دوسری جانب فرقہ پرست اور شرپسند عناصر بابری مسجد کا وجود ختم کر کے اس پر نام نہاد رام جنم بھومی کی تعمیر کے لئے کمربستہ ہیں۔ حق و انصاف اور تاریخ و عدالت کا خون کر کے اجودھیا کی سرزمین پر فاشزم کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت انہوں نے داؤ پر لگادی ہے۔ اور وہ ہندوستان کے دستور و آئین اور اس کے سیکولرزم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔

ماضی میں جو کچھ ہوا وہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، لیکن اب مرکزی حکومت کو چاہئے کہ کوئی وقت ضائع کئے بغیر یو۔ پی کی بھاجپا گورنمنٹ کو لگام دے کہ وہ کسی متنازعہ زمین کو ایکوائر نہ کر سکے۔ اور اپنے سرکاری اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ اسی طرح وشو ہندو پریشد کو بھی اس کا پابند بنائے کہ وہ کسی متنازعہ زمین پر کوئی ناجائز تعمیر نہ شروع کر پائے۔ ساتھ ہی بابری مسجد کے تحفظ کے لئے ضرورت کے مطابق مرکزی فورس بھی تعینات کرے۔

سبھی انصاف پسند اور سیکولر پارٹیوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ ملک کے اتحاد و سالمیت کے پیش نظر اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر جرأت کے ساتھ میدان میں آئیں اور فسطائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مل جل کر مقابلہ کریں۔ ورنہ اس نازک موقع پر انتہا پسند لیڈرشپ اور تخریبی و سازشی عناصر کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تو اس کا خمیازہ پورے ملک کو بھگتنا پڑے گا۔ اور آنے والی نسل ان کی اس کوتاہی اور غلطی کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

(۱) علامہ ارشد القادری (صدر) (۲) مولانا یٰسین اختر مصباحی (نائب صدر) (۳) مولانا عبید اللہ خاں اعظمی ایم پی (سکریٹری جنرل) (۴) مولانا محمد ادریس بستوی (جنرل سکریٹری)

(ص ۵۴۔ ماہنامہ حجاز جدید دہلی ستمبر ۱۹۹۲ء)

حکومت کی ذمّہ داری اور مسلمانوں کا احتجاج

بابری مسجد کے تحفظ کا مسئلہ اب بالکل آخری مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے۔ حالات اتنے سنگین ہیں کہ ادنیٰ سی غفلت سے بھی پورے ملک کا امن وامان خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔
وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور بھاجپا کی قانون شکنی وسرکشی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ملک سے انتظام وقانون کی حکومت کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اگر حکومت طاقت کے آگے بالکل جھک گئی اور قانون کا مذاق اڑانے والوں کو لگام نہیں دی گئی تو لاقانونیت کی یہ آگ بابری مسجد تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ پارلیمنٹ کا وقار بھی جل کر خاکستر ہوسکتا ہے۔
ملک کے تحفظ وسالمیت کے لئے اگر مختلف حصوں میں فوج سے مدد لی جاسکتی ہے تو اجودھیا میں قانون کے باغیوں کو ملک کی سلامتی سے کھیلنے کی اجازت کیوں دی جائے؟ اب سوال کسی ایک فرقہ کی عبادت گاہ کے تحفظ کا نہیں بلکہ ملک کے آئینی ڈھانچے کو بچانے کا ہے۔
بابری مسجد کے مسئلہ میں مسلمانوں کا یہ کردار آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ انہوں نے انتہائی صبر وضبط سے ہمیشہ صرف حکومتوں کے حفاظتی اقدامات کا انتظار کیا ہے۔ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے طور پر اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ان نازک ترین اور انتہائی اشتعال انگیز حالات میں بھی مسلمان اپنے ضبط وتحمل اور بصیرت وفراستِ ایمانی کی روایات کو برقرار رکھیں گے۔
اگر حالات بہت زیادہ مجبور کردیں تو اپنے جذبۂ بے اختیاری کی تسکین کے لئے حکومتِ وقت کے خلاف صف آرا ہوں۔ اور اپنے احتجاج ومظاہرہ کا رخ صرف اسمبلی و پارلیمنٹ تک محدود رکھیں۔ اور دستوری وقانونی جدوجہد تیز تر کردیں۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ خداوند ذوالجلال کی خفیہ تدبیریں اپنے گھر کی حفاظت کے لئے ضرور حرکت میں آئیں گی۔ اور ہمیں صرف اسی کا سہارا ہے۔

دستخط کنندگان:۔ (۱) علامہ ارشد القادری صدر کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس (۲) مولانا لیٖس اختر مصباحی نائب صدر (۳) مولانا عبید اللہ اعظمی ایم پی جنرل سکریٹری (۴) مولانا محمد ادریس بستوی جنرل سکریٹری۔

(مجریہ ۲۰؍جولائی ۹۲ء مطبوعہ متعدد اخبارات)

علماء کرام کا بیان

الہ آباد ۶؍دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء اہلِ سنت کے ممتاز عالم دین حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی بانی دارالعلوم غریب نواز کے عرس جہلم کے موقع پر ملک کے مشاہیر علماء کرام و مشائخ عظام کی ایک خصوصی نشست بتاریخ ۶؍دسمبر سنہ ۹۰ء بمقام دارالعلوم غریب نواز الہ آباد ہوئی، جس میں حالاتِ حاضرہ پر غور و خوض اور تبادلہ خیالات کیا گیا اور اتفاقِ رائے کے ساتھ مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) بابری مسجد اجودھیا جو تاریخی اور قانونی حیثیت سے مسجد ہی ہے اس کی بیع یا منتقلی کسی شکل میں جائز نہیں۔ نہ اسے کسی حال میں تبدیل کرنے یا کسی کے حوالہ کرنے یا اسے اکوائر کرنے کا کسی فرد یا جماعت یا حکومت کو اختیار ہے، کیوں کہ مسجد کی زمین خدا کی مِلک ہے۔ اور اس میں کوئی شخص کسی طرح کا تصرف نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے ۲۲؍دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے کی حالت میں لاتے اور عام مسلمانوں کو اس میں نماز وغیرہ کی غیر مشروط اجازت دینے کے علاوہ کوئی دوسرا حل مسلمانانِ ہند کے لئے قابلِ قبول نہیں۔

(۲) ۹؍نومبر سنہ ۱۹۸۹ء کو بابری مسجد سے ملحقہ قبرستان کی متنازعہ زمین پر ہونے والا شیلانیاس ناجائز وغیر قانونی ہے اس لئے اس جگہ پر کارسیوا کی اجازت کسی حال میں نہیں دی جا سکتی۔

(۳) بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی فرقہ پرست تنظیموں کی بڑھتی ہوئی زہر افشانی و جنگ جوئی کی روک تھام کے لئے فوری طور پر مناسب اور سخت کارروائی کی جانی چاہئے۔ تاکہ ملک کے اتحاد و سالمیت کو کوئی نقصان نہ پہونچ سکے۔ اور سبھی برادرانِ وطن مِل جُل کر ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتے رہیں۔

(۴) مسلم قائدین و عوام ہوش مندی اور دُور اندیشی کے ساتھ موجودہ نازک حالات

مظاہرہ سے گریز کرتے ہوئے
سڑک پر آکر غیر ضروری احتجاج و مظاہرہ سے گریز کرتے ہوئے
کا مقابلہ کریں۔ سڑک پر آکر غیر ضروری احتجاج و مظاہرہ کے ساتھ اپنے آئینی و جمہوری حقوق کے تحفظ کی موثر تدابیر
خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ فراستِ ایمانی کا بھی مظاہرہ کریں۔
اختیار کریں۔ اور حرارتِ ایمانی کے ساتھ ساتھ فراستِ ایمانی کا بھی مظاہرہ کریں۔

دستخط کنندگان

حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی صدر شعبۂ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارکپور۔

حضرت علامہ ارشد القادری صدر کل ہند مسلم پرسنل لاء کانفرنس۔

حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔

حضرت مولانا ادریس رضا حشمتی۔ پیلی بھیت۔ یوپی۔

حضرت مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی شیخ الادب جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔

حضرت مولانا لیٰس اختر مصباحی نائب صدر کل ہند مسلم پرسنل لاء کانفرنس۔

حضرت مولانا مفتی شفیق احمد شریفی صدر مدرس دارالعلوم غریب نواز۔ الٰہ آباد۔

حضرت مفتی اختر حسین قادری صدر المدرسین دارالعلوم رضویہ کیتھون۔ کوٹہ۔

حضرت مولانا سید اصغر امام قادری صدر مدرس جامعہ فاروقیہ بنارس۔

حضرت مولانا ظہیر الدین قادری مدیر اعلیٰ ماہنامہ استقامت کانپور۔

حضرت سید محمد اکمل اجملی ایم اے، پی ایچ ڈی۔

حضرت مولانا سید محمد افضل اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل۔ الٰہ آباد۔

حضرت مولانا سید شمیم گوہر مصباحی الٰہ آبادی ایم اے، پی ایچ ڈی۔

حضرت مولانا ملک الظفر، ناظم مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام۔ بہار۔

(ص ۱۱۰ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ جنوری فروری ۱۹۹۱ء)

اختلافات کے باوجود
مُسلمانانِ ہند کا اِتّحاد

روزنامہ اِمروز بمبئی نے کُل ہند مُسلم پرسنل لاء کانفرنس کے نائب صدر مولانا یٰسٓ اختر مصباحی، سکریٹری جنرل مولانا عبید اللہ اعظمی، جنرل سکریٹری مولانا محمد ادریس بستوی سے ملک وملّت کو درپیش چند اہم مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اور پھر اس انٹرویو کو ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں شائع کیا

سوال :- ایک عام خیال یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء اور بابری مسجد جیسی تحریکوں اور شور کی وجہ سے مسلم معاشرے کو میرٹھ اور ملیانہ جیسے تکلیف دہ دَور سے گزرنا پڑا۔ کیا آپ کے خیال میں علماء کرام نے ان تحریکوں میں حصّہ لے کر غلطی کی ؟

جواب :- مسلم پرسنل لاء اور بابری مسجد کے تحفظ کی تحریک سے میرٹھ اور ملیانہ کے فسادات کا رشتہ جوڑنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ ان فسادات کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب مسلمانانِ ہند کے اندر کوئی ایسی باضابطہ تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ حکمراں جماعت اور فرقہ پرست تنظیمیں اپنے سیاسی اغراض ومقاصد کے پیش نظر ۱۹۴۷ء ہی سے اس طرح کے فسادات کراتی رہتی ہیں۔ میرٹھ وملیانہ کا بھیانک فساد بھی شرپسند سیاسی لیڈروں و فرقہ پرست افسروں کے سازشی ومذموم عزائم کا افسوسناک نتیجہ ہے۔

البتہ اس میں بابری مسجد کو بطور ایندھن استعمال کیا گیا۔ اگر بابری مسجد کا مسئلہ نہ ہوتا تو پٹرول ڈالر یا پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرادیا جاتا جیسا کہ جبل پور، جمشید پور،

کے فسادات کے موقع پر کیا گیا۔

علی گڑھ، مرادآباد، بھیونڈی اور آسام وغیرہ کے فسادات کے موقع پر کیا گیا۔
مسلم پرسنل لاء و بابری مسجد کے تحفظ کی تحریک میں علماء کرام نے حصہ لے کر اپنا فرضِ منصبی ادا کیا کیوں کہ ایک منصوبہ بند طریقے سے جان کے بعد ایمان پر حملے کا آغاز کیا گیا تھا جس کا سدِّ باب نہایت ضروری اور اہم دینی وملی فریضہ تھا۔ علماء کرام نے اگر ایسے نازک موقع پر اپنی جرأت و ہمت اور بصیرت وفراستِ ایمانی کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو آج نہ جانے کتنی مسجدوں اور قوانین شریعت کی صورت مسخ کرنے کے اسباب پیدا کیئے جا چکے ہوتے اور علماء کرام کا یہ کردار نہایت قابلِ تعریف رہا کہ انہوں نے ان دونوں تحریکوں کو ضبط و تحمّل کے دائرے میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور کسی اشتعال انگیزی و ہنگامہ خیزی کی انہوں نے کبھی اجازت نہیں دی۔

سوال:۔ مسلم سیاسی رہنما اور علماء کرام سب ہی بابری مسجد پر خاموشی اختیار کر چکے ہیں۔ کیا اس خاموشی میں سرکاری دباؤ کارفرما ہے؟

جواب:۔ علماء کرام نہ خاموش ہوئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کسی طرح کا دباؤ قبول کیا ہے۔ ملاقات وگفتگو کے ذریعہ وہ مسلمانانِ ہند کو بازیابی بابری مسجد کے اہم مسئلہ کی طرف ہمیشہ متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ ابھی چند دنوں پہلے دو سو سے زائد عمائد وقائدینِ ملت نے دہلی میں گرفتاری دی۔ پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر کھل کر بحث ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں حکومت اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی۔ پہلے تو مرکزی حکومت کی جانب سے یہ کہا جاتا تھا کہ یہ عدالت اور صوبائی گورنمنٹ کا معاملہ ہے، لیکن اب پارلیمنٹ کے اندر مرکزی وزیر داخلہ نے یہ اعلان کیا کہ اس مسئلہ کو جلد از جلد حل کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے ایک کمیٹی بنادی ہے۔ ایسے حالات میں خاموشی یا دباؤ قبول کرنے کی بات کو غلط فہمی وبدگمانی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

سوال:۔ علماء کرام سے ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے مسلمانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ کیا آپ کو اس شکایت سے اتفاق ہے؟

جواب:۔ علماء کرام کو نشانۂ طعن وتشنیع بنانا آج کل ایک عام فیشن بن گیا ہے اور

قومی واجتماعی عیوب ونقائص کا انہیں بلا دلیل ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ یہ رجحان اور طرزِ فکر نہایت ضرر رساں اور تباہ کُن ہے۔

اکثر علماء کے ذاتی اعزاض تو کچھ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر ان کے درمیان ضرور تقسیم ہو جاتی ہے، لیکن یہ تقسیم عام قومی مسائل میں حائل نہیں ہونے پاتی اور سبھی علماء متحد و متفق ہو کر حفاظتِ دین کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ مسلم پرسنل لار اور بابری مسجد کی تحریک اس کا بہترین ثبوت ہے۔ البتہ ہماری صفوں میں کچھ نام نہاد علماء ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو اپنے ایمان و ضمیر کا سودا کرنے میں کچھ زیادہ ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے۔ ایسے قوم فروشوں کو مسلمانانِ ہند خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ اس لیے ان علماء کو علماء حق سے دُور رکھنا، اور اسی طرح الگ سمجھنا بہتر اور ضروری ہے۔ جس طرح بیشتر سیاسی زعماء و قائدین جو اپنے جماعتی و گروہی مفادات کے خول سے باہر نکل کر مسلم مفادات کی نمائندگی و حفاظت نہ کرنے کی پاداش میں مسلم معاشرے کے عتاب کا شکار ہیں۔ اور اپنے اپنے انتخابی حلقوں میں بھی انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا پڑ رہا ہے۔

سوال:۔ مسلمانوں کے مابین باہمی اتحاد پیدا کرنے اور اختلافات کی خلیج پاٹنے کے لیے آپ نے کوئی ٹھوس کارروائی کی ہے۔ یا آپ کے نزدیک یہ ایک فضول بات ہے؟

جواب:۔ مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج پاٹنے سے پہلے ان غلط عناصر کے خلاف برسرِ پیکار ہونا پڑے گا جو اس خلیج کو روز بروز گہری کرتی جا رہی ہیں۔ اتحاد اسلامی کی دعوت ایک اچھی اور مسلمانوں کے لیے بہت ضروری چیز ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اصولی اور بنیادی چیزوں پر مسلمان متفق ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ متحد ہی رہیں۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہر نازک موڑ پر قابلِ تقلید اتحاد کا ثبوت دیتے ہیں۔ اردو زبان، ملازمت، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار، انسداد فسادات، مسلم پرسنل لار، بابری مسجد جیسے اہم مسائل پر اپنے اتحاد کا انہوں نے ایسا عظیم الشان مظاہرہ کیا جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے۔

سوال :- ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہیں صحیح رہنمائی حاصل نہیں۔ سیاست داں اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہیں، تو کبھی پارٹی بندی کی مصلحت راہ میں حائل ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے سیاست کو شجرۂ ممنوعہ کبھی نہیں سمجھا۔ ان نازک حالات میں علمار کرام مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی پر غور نہیں کرتے؟

جواب :- سیاست اسلامی مذہب اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ مسیحیت نے پارلیمنٹ اور چرچ کے درمیان جس طرح حدِ فاصل قائم کردی ہے ایسا کوئی تصور اسلام کے اندر نہیں۔ نہ ہی اس نے دین و سیاست کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ علمار کرام دینی علمی و فکری قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے اس فرائض کی ادائیگی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ عام سیاست دانوں کی طرح وہ مروجہ ہتھکنڈے نہ استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی اسلام ان کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے قومی و ملی مسائل کے حل کے لئے ہمیشہ جائز و معقول راہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

کسی قومی پارٹی میں شریک ہو کر یا اپنی الگ سیاسی جماعت بنا کر خدمت قوم و ملت کی راہ کا تعین ایک مشکل کام ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ صالح و تعمیری ذہن رکھنے والے افراد مجتمع ہو کر پہلے اپنی ایک موثر قوت بنالیں اس کے بعد حالات کو سامنے رکھ کر کوئی قدم اٹھائیں اور اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ملک و قوم کو فائدہ پہونچاتے رہیں۔ بعض معاصر اقوام اس فارمولا پر عمل کر کے نہایت کامیاب و سرخ رو زندگی بسر کر رہی ہیں۔

سوال :- معاملہ سیاست کا ہے تو کیا آپ مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی پارٹی بنانے یا قومی سیاسی پارٹیوں میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے؟

جواب :- اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ کام کیا جائے تو انشاء اللہ سارے پیش آمدہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ منصوبے بہت سے ہیں اور انہیں ہم عملی شکل بھی دینا چاہتے ہیں۔ اپنے محدود وسائل و ذرائع کے مطابق ہر میدان میں آگے بڑھنے کی اپنی قوم کو ترغیب دیتے ہیں تاکہ وہ برادرانِ وطن سے آگے یا کم از کم ان کے برابر ہو کر باوقار زندگی بسر کریں۔

سوال :- ہندوستانی مسلمانوں کو اقتصادی، تعلیمی اور دیگر پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے کوئی عملی اور ٹھوس اسکیم آپ کے پاس ہے؟

جواب :- ہندوستان میں صرف مسلمانوں پر ظلم نہیں ہوتا بلکہ بہت ساری قومیں برہمن ازم کا شکار ہو کر مقہور و مظلوم زندگی گزار رہی ہیں۔ پنجاب، بہار، میزورم، دلرجلنگ کی جانب نگاہ اٹھایئے تو آپ کو بے شمار شواہد مل جائیں گے۔ یہ فسادات مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ساری کمزور و مظلوم ہندوستانی قوموں اور طبقوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ اگر یہ سارے مظلوم اور کمزور طبقے ایک آواز ہو کر اٹھ کھڑے ہوں تو ظالموں کو بہت جلد سرنگوں ہو جانا پڑے گا۔

سوال :- آپ کے خیال میں فسادات میں مرنا، لٹنا اور جلنا ہندوستانی مسلمانوں کا مقدر بن گیا ہے؟ ان حالات سے کس طرح نپٹا جاسکتا ہے؟

جواب :- ہندوستان کے موجودہ حالات میں جہاد کی کوئی شرعی گنجائش نہیں کیوں کہ اس کی شرطیں یہاں نہیں پائی جاتیں اور ہجرت جہاد کا بدل ہے کہ اگر جہاد کی طاقت و استطاعت نہ ہو تو ہجرت کی جائے۔ جب جہاد ہی کا وجوب ثابت نہیں تو ہجرت کا کیا سوال؟

موجودہ حالات میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ تعلیم و تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ میں جد و جہد کر کے اپنی آنے والی نسل کو آگے بڑھائیں اور اس جہاد زندگی میں اپنے آپ کو مردِ میدان ثابت کریں۔ حق کی نصرت و حمایت انشاء اللہ ہر گام پر ان کے ساتھ ہو گی۔

(ص ۲۔ روزنامہ امروز۔ بمبئی ۵، دسمبر ۸۷ء)

۶/دسمبر ۹۲ء

آزاد ہندوستان کا سیاہ دن

۶/دسمبر ۹۲ء کو شر پسند عناصر نے نہ صرف بابری مسجد کو مسمار کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی اس بزدلانہ وسنگدلانہ حرکت سے جہاں ایک طرف اس مسجد اور مسلمانانِ ہند کے مذہبی حقوق پر حملہ کیا ہے، وہیں دوسری طرف ہندوستان کے دستور وآئین اور جمہوریت وسیکولرزم کے ڈھانچہ کو بھی پاش پاش کردیا ہے اور عالمی سطح پر اپنے ملک کے وقار کو مجروح اور اس کی غیر جانب داری مذہبی پالیسی کو داغدار بنا ڈالا ہے۔

ہندوستان کے طول وعرض میں تخریب پسند عناصر اور پولیس کی مدد سے جو بھیانک مسلم کش فسادات ہوئے اور ملکی اتحاد وسالمیت کو فرقہ پرستوں نے جس جنونی انداز میں چیلنج کیا اس کی نظیر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک نہیں ملتی۔ مذہبی لبادہ میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے نام پر ملکی اور غیر ملکی سیاست نے بھی اس خونیں کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور امن پسند عوام کو اپنی شاطرانہ سیاست کا شکار بنایا۔

مستقبل کے سنگین خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے حکومتِ ہند کو چاہیے کہ وہ صرف انتہا پسند تنظیموں پر پابندی اور بھاجپا کی ریاستی حکومتوں کو برخاست کرکے بابری مسجد کے بارے میں پارلیمنٹ کے اندر مذمتی قرارداد پاس کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ نظریاتی طور پر جارحیت پسند عزائم کو ناکام بنانے کی سنجیدہ کوششوں کا آغاز کرے اور اس کے لئے عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کے ساتھ ذرائع ابلاغ کا بھی صحیح اور مناسب استعمال کرے۔

انصاف و قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے بابری مسجد کی تعمیر نو کا فوراً انتظام کرے۔ فساد سے متاثرین اور مظلومین کی مالی امداد کے ساتھ اس حادثہ کے وقت شہید ہونے والی سبھی مساجد و مقابر اور مکانات کی مرمت و تعمیر کے لئے فوری قدم اٹھائے اور مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انہیں قرار واقعی سزا دے۔

چوں کہ اصل مسجد اس کی زمین ہوتی ہے اس لئے عمارت کے انہدام کے بعد بھی مسجد کی زمین مسجد ہی ہے۔ لہٰذا تعمیر تو اسی زمین پر ہونی ضروری ہے۔ اور تعمیر نو یا ٹرسٹ کے لئے صرف اجودھیا و فیض آباد کے مسلمانوں کا انتخاب کر کے انہیں ہی ذمہ دار بنایا جائے۔ اور مسئلہ کے حل کے لئے مفاد پرست سیاست دانوں کو دور رکھ کر صرف مذہبی شخصیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔

مسلم تنظیمیں اس نازک موقع پر بھرپور اتحاد و اتفاق اور فراستِ مومنانہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ قانونی کارروائی اور اصل زمین پر بابری مسجد کے جمہوری مطالبہ سے ہرگز دست بردار نہ ہوں۔ اور ضرورت پیش آئے تو کوئی بھی باضابطہ اجتماعی مذاکرہ اسی وقت شروع کریں جب وشو ہندو پریشد اور دیگر متعلقہ تنظیمیں اس بات کا تحریری معاہدہ کرلیں کہ وہ مسلّمہ تاریخی حقائق اور دستور و قانون کے پابند رہ کر گفتگو کریں گی اور اپنی سیاست و طاقت اور اکثریت کے بل پر دھمکی آمیز لہجہ اختیار نہیں کریں گی۔

دستخط کنندگان

(۱) یٰسٓ اختر مصباحی نائب صدر (۲) عبید اللہ اعظمی ایم پی سکریٹری جنرل

(۳) محمد ادریس بستوی جنرل سکریٹری

(ہفت روزہ جریدہ ٹائمز نئی دہلی - ۱۳ ر تا ۱۹ ر جنوری ۱۹۹۳ء)

مستقبل کی تعمیرِ نو

بابری مسجد کی شہادت اور اس کے ردِ عمل میں پورے برصغیر کے اندر ہونے والے ہولناک فسادات اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے ہندوستان کے امن و قانون کی بنیادیں لرزاٹھی ہیں۔ اور جذبات کے طوفان میں ہوش و حواس اور فہم و فراست نیز انسانیت دوستی کی بہت سی قدریں، تنکے کی طرح بکھرتی اور ہوا میں ہر طرف اُڑتی نظر آرہی ہیں۔

ہیجان انگیز ہنگامی حالات کا فائدہ اٹھاکر کچھ لوگ لال قلعہ، قطب مینار اور تاج محل کو اپنے عہدِ غلامی کی یادگار سمجھ کر انہیں نیست و نابود کر ڈالنے کے درپے ہیں جن کا اگلا نشانہ سپریم کورٹ، پارلیمنٹ، اور پریسیڈنٹ ہاؤس کی عظیم الشان عمارتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ تو دوسری طرف کچھ لوگ اپنے حقوق کی تلاش میں ملک سے باہر اخلاقی و سفارتی تعاون حاصل کرکے آر ایس ایس اور سی آئی اے دونوں کو ایک ساتھ اپنے سر پر مسلط کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

کیا ان مشتعل جذبات اور ممکنہ اقدامات کے پیچھے تخریبی سیاست و شہرت پسندی اور مفاداتِ حاصلہ کے علاوہ کچھ اور بھی اسباب و عوامل کی کارفرمائی ہو سکتی ہے؟ زخموں کی تجارت اور لاشوں کی سوداگری کا یہ منحوس سلسلہ خدا جانے کب اپنے اختتام کو پہنچے گا۔

بابری مسجد کی شہادت ملک کی عدلیہ و انتظامیہ کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق اور فرقہ پرست عناصر کی کھلی ہوئی جیت ہے جس کا وہ جگہ جگہ جشن منا رہے ہیں اور ان کے ناپاک عزائم اور فتنہ پرور سازشیں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

حکومتِ ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ دستور و قانون کی بالادستی اور امن و انتظام کی بحالی کے لئے ہر ممکن قدم اٹھاکر ہندوستان کی عالم گیر بدنامی اور اس کی پیشانی

لگ جانے والے داغ کو مٹانے کی جلد از جلد کوشش کرے۔ اور یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب بابری مسجد کی اپنی اصل جگہ پر تعمیرِ نو اور اس میں نماز و عبادت کی مسلمانانِ ہند کو غیر مشروط اجازت مل جائے۔

مفاد پرست سیاست دانوں کی بجائے ملک کے ممتاز و مستند علماء کرام سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا جائے اور بابری مسجد کے انتظام و تولیت کا ذمہ دار صرف اجودھیا و فیض آباد کے مسلمانوں کو بنایا جائے کیوں کہ اصولی طور پر مقامی آبادی کے مسلمانوں کو ہی مساجد کے انتظامات اور ان کی دیکھ بھال کا حق ہوا کرتا ہے۔ اگر غیر مقامی افراد بالخصوص سیاست دانوں کو اس کے ٹرسٹ میں شامل کرنے کی غلطی کی گئی تو پھر اسے رفتہ رفتہ مفاد پرست سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا جائے گا اور مستقبل قریب ہی میں اس کے نہایت افسوسناک اور بھیانک نتائج سامنے آسکتے ہیں جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ مسجد کی اصل اس کی زمین ہوا کرتی ہے اور عمارت کے انہدام کے بعد بھی اس کی مسجدیت حسب سابق باقی رہتی ہے۔ اس لئے بابری مسجد اپنی اصل زمین پر بننی چاہئے اور اس سے الگ ہٹ کر کسی نئی مسجد کی تعمیر سے نہ تو انصاف و قانون کا تقاضہ پورا ہوگا اور نہ کسی نئی مسجد کی اجودھیا کے مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ اور نہ ہی بابری مسجد پر دعویٰ استحقاق سے کوئی مسلمان دست بردار ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے مستقبل کی تعمیرِ نو کے لئے ضروری ہے کہ حالات پُر امن ہوں۔ لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا بحال ہو۔ ان کی توجہ مثبت اور روشن پہلوؤں کی طرف مبذول کرائی جائے تاکہ ان کی بہترین اور اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کا صحیح اور مناسب استعمال ہو سکے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۲ء

یٰسٓ اختر مصباحی
نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس

(یو۔ این۔ آئی اور بہت سے انگریزی رہندی راردو اخبارات نے اپنے انداز سے اسے شائع کیا)

۶ر سے ۸ر دسمبر تک کا

آنکھوں دیکھا حال

۶ر دسمبر اتوار کی صبح مانس بھون سے منظر بالکل صاف تھا، سرجو کے اوپر کہر بھی دور ہو چکا تھا۔ ۴۶۴ سال پرانی عبادت گاہ اپنی خستہ حالی کے باوجود اپنی شان و شوکت کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔

۹ بجے صبح لاؤڈ اسپیکر سے ایک اپیل کی گئی۔ کارسیوکوں کو مارگ درشک منڈل کے ممبروں کے لیے چبوترا خالی کرنا تھا جو ادھر آرہے تھے۔ جیسے ہی "مقدس ہستیاں" داخل ہوئیں کوئی قریب ہی واقع پریشد کے آفس سے ایک میلا کچیلا سا کمبل لے آیا اور اسے چبوترے کے ایک کونے پر پھیلا دیا اور اس پر گیندے کے چند ہار لاکر ڈھیر کر دئے۔ یہی وہ مذہبی رسوم تھیں جو اس منحوس دن ادا کی گئیں۔

تقریباً ایک سو پولیس والوں اور اتنے ہی خاکی نیکر دھاری آر ایس ایس کے رضا کاروں نے متنازعہ پلاٹ کے ارد گرد پائپوں کے ذریعہ رکاوٹیں کھڑی کیں۔ گھیرے کو توڑنے کی سب سے پہلی کوشش ایک کلین شیو پجاری نے کی جو چمک دار پیلے کپڑے پہنے ہوئے اور ایک بھالا لئے ہوئے تھا۔ وہ رکاوٹوں کو پار کر کے اندر گھس گیا لیکن آر ایس ایس والوں نے اس سے واپس چلے جانے کے لئے کہہ دیا تو وہ واپس چل بھی دیا لیکن جیسے ہی گارڈ ہٹے وہ پھر تیزی سے گھوم گیا۔ وہ ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ایک ڈھیر پر چڑھا اور سیدھا چبوترے کی طرف بھاگا چلا گیا۔ گارڈ نے اس کا تعاقب کر کے اسے اس وقت پکڑ لیا جب وہ پلیٹ فارم سے متصل گول خندق میں گر گیا۔

اسی دوران ایک اور سادھو، جو گندی سی سفید چادر لپیٹے ہوئے تھا اندر گھس گیا۔

ایک ادھ نے ستون پر جا پڑا اور ایک ویڈیو کیمرہ والے کو دھکیل دیا اور اس کی چیخ و پکار جے شری رام کے نعروں اور رکاوٹوں کے باہر کی بھیڑ کی گالیوں میں سنی نہیں جاسکی، لیکن اسے بھی باہر دھکیل دیا گیا۔ اس طرح کی حرکتیں تقریباً آدھے گھنٹہ تک چلتی رہیں اور پھر مسجد کے بائیں طرف کی سڑک پر واقع رکاوٹوں کے اس پار کی بھیڑ اودھم مچانے لگی۔ بھیڑ نے گھیرے کو توڑنے اور متنازعہ پلاٹ میں گھس جانے کی کوشش کی مگر گارڈ نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد سادھوی رتمبرا اپنے انداز میں داخل ہوتی۔ اسے پریشد کی بعض معزز شخصیتوں نے متنازعہ پلاٹ کے گرد گھمایا۔ جلد ہی دوسری شعلہ بیان سنیاسن اوما بھارتی بھی آملیں دونوں خستہ حال اناؤنسمنٹ پلیٹ فارم پر جا کر چھپ گئیں۔

ٹھیک ۱۰ بجے اشوک سنگھل اور بجرنگ دل لیڈر ونے کٹیار ایم پی عبادت گاہ کے بائیں طرف کی تنگ گلی کی طرف بڑھے۔ وہ جیسے ہی متنازعہ پلاٹ میں داخل ہوئے بھیڑ نے ان کے پیچھے چلنے کی کوشش کی۔ چند سو اندر گھس گئے لیکن باقی کو روک دیا گیا۔

جو بیری کیڈس کے اوپر چڑھ گئے تھے پلیٹ فارم سے چند قدم دور رک کر "جے شری رام" کے نعرے لگانے لگے۔ پلیٹ فارم کے اوپر موجود "مقدس شخصیات" نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ فیض آباد ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ اندر گھسے اور انہوں نے وہاں پانچ منٹ گزارے اور جیسے آئے تھے ویسے ہی جلدی سے نکل گئے۔

۱۱ بجے سیکورٹی سائرن بج اٹھے۔ ایل کے اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی کا قافلہ ۱۲ افٹ چوڑی سڑک پر پہونچ چکا تھا جس کے پیچھے جنونی بھیڑ تھی۔ جیساکہ ہم نے بعد میں دیکھا شورش برپا کرنے والی پارٹی جسے ہم نے ریہرسل کرتے دیکھا تھا نے بائیں جانب سے مسجد پر حملہ کیا تھا۔

ایک بہت بڑی بھیڑ لیڈروں کے ساتھ پلاٹ پر پہونچ گئی لیکن ان کے کدال بردار دست اخبار نویسوں کی آنکھوں سے دور مانس بھون ہی میں چھپے رہے صرف سلک کے کپڑے پہنے ایک سنیاسن اپنے اسٹاف کے ساتھ ان چڑھنے والوں کو روکنے کی کوشش کرتی رہی باقی تمام لطف اندوز ہوتے نظر آرہے تھے جن میں اڈوانی اور جوشی پلاٹ .

اوپر سے بڑی شان سے گزر رہے تھے اور اوما بھارتی ورتمبرا پویلین میں بیٹھی تھیں، نیز اشوک سنگھل اور کٹیار ادھر ادھر رقص کر رہے تھے۔

سیکڑوں کارسیوک مانس بھون چبوترے کے اوپر چڑھ گئے اور صحافیوں پر گویا قہر خداوندی بن کر ٹوٹ پڑے۔ اس سے ملحق تمام بلڈنگوں کے چبوتروں پر جن میں سیتا کی رسوئی بھی شامل ہے جہاں یو پی پولیس کیمپ ڈالے ہوئی تھی، بھیڑ نے قبضہ کر لیا۔ گندے الفاظ اور گرد و غبار سے فضا آلودہ ہو چکی تھی۔ ۵-۴۰-۱۱ پر اعلان ہوا کہ مذہبی رسم مجوزہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد شروع ہوگی۔ یہ مسجد کے دائیں جانب کارروائی کے لئے تیار کارسیوکوں سے توجہ ہٹانے کے لئے ایک ڈرامہ تھا۔ یہاں ایک یکہ و تنہا پولیس والا مسجد کے احاطہ کی دیوار پر پتھراؤ سے بچنے کے لئے اپنی بانس کی شیلڈ سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک نوجوان رسی لئے ہوئے دیوار پر چڑھا اور ایک منٹ کے لئے پولیس والے سے گتھ گیا۔ پولیس والا اس کو نیچے دھکیلنے کے بعد مسجد پر دیوانگی کے ساتھ چڑھنے والوں پر نیچے سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔

صرف نامعلوم پولیس والا ہی مسجد کے لئے لڑا تھا اس کے تمام کامریڈ اس کی ناکام کوشش کو چند منٹ تک دیکھتے رہے اور پھر جیسے احکامات مل گئے ہوں احاطہ میں تعینات تمام پولیس کے نوجوان ایک کونہ میں چلے گئے۔

کمانڈنٹ اے شنٹ نے جو مسجد کے اندر سی آر پی ایف کے جوانوں کے انچارج تھے بعد میں کہا، "مجھے یہی پتہ نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے میرے پاس صرف فائرنگ کا راستہ تھا لیکن وہاں اتنے آدمی تھے کہ یہ بے فائدہ ہوتا۔"

داخلہ پوائنٹ پر تعینات ریاستی پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی اور پی اے سی لے تو اپنے کیمپوں سے باہر نہیں نکلے۔ جیسے ہی سی آر پی ایف کے جوان الگ ہٹے، بھیڑ جو ... اور جوشی کے ساتھ آئی تھی مسجد کی طرف دوڑ پڑی۔

جس بدمعاش نے پولیس والے کو نیچے دھکیل دیا تھا ایک رسی اوپر پھینکی جو داہنی طرف ... میں پھنس گئی۔ چند منٹ کے لئے وہ گنبد کے پیچھے چلا گیا اور پھر گنبد کے اوپر چڑھتا

ہوا دیکھا گیا۔ اسی دوران گنبد کے پیچھے سے ایک اور نوجوان ظاہر ہوا جو بھگوا جھنڈا اپنے سینے سے باندھے ہوئے تھا۔ پہلے نوجوان نے اسے کھولا اور جے شری رام کے پُر جوش نعروں کے درمیان گنبد کے کلش سے باندھ دیا اس وقت نصف النہار میں دو منٹ باقی تھے۔

چند منٹ کے اندر اندر لوگ تینوں گنبدوں پر پہونچ گئے تھے۔ جو بھیڑ اڈوانی اور جوشی کے ساتھ اپنی کدالیں لئے ہوئے آئی تھی آگے بڑھی اور ایک بار پھر مسجد کے ارد گرد تعینات پولیس والے گلیوں میں نکل آئے لیکن نہ ایک گولی چلی اور نہ ہی کسی پر کوئی ایک بھی ڈنڈا پڑا۔ کدال برداروں نے دیواریں مسمار کر ڈالیں لیکن پہلا گنبد گرنے میں دو گھنٹے سے زیادہ لگ گئے۔

حیران و پریشان ضلع مجسٹریٹ آر این شریواستو نے تقریباً ایک بجے ریپڈ ایکشن (سریع الحرکت) فورس طلب کی۔ ایک گھنٹہ بعد یہ فورس پہلی بار اس جگہ پہونچی جہاں اجودھیا کے نواح میں روڈ بلاک کئے ہوئے تھے۔

فورس کی سربراہی کرنے والے پی ایم سروت نے بعد میں کہا کہ حالات بہت زیادہ خراب نہیں تھے ہم آسانی سے اسے صاف کر سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ چلنے والے مجسٹریٹ نے ایک نہ سُنی۔ اس نے فورس کو واپسی کا حکم دے دیا۔ سروت نے اس پر اصرار کیا اور مجسٹریٹ سے تحریری آرڈر مانگا تو واپسی کا آرڈر دے دیا گیا۔

اسی دوران مسجد کی باہری دیوار ایک بج کر ۳۰ منٹ پر گر چکی تھی۔ تقریباً تمام بیری کیڈ اکھاڑ دئے گئے تھے، ہر جگہ سے خاردار تار کاٹ دئے گئے تھے۔ مسجد کے اندر اور باہر ہر جگہ سے بجلی کے تار نوچ ڈالے گئے تھے جس سے سرکٹ ٹی وی سسٹم بند ہو چکا تھا۔

لاؤڈ اسپیکروں سے صرف رتمبرا اور اوما بھارتی کے جوشیلے نعرے ہی سنائی دے رہے تھے۔ اوما بھارتی کارسیوکوں کو شاباشی دے رہی تھیں اور ایک دھکا اور دو، بابری مسجد توڑ دو، اور زور اور زور، رتمبرا اپنا مشہور آلہا گا رہی تھیں "خون خرابہ ہونا ہے تو ایک بار ہو جانے دو"۔

آر ایس ایس کے لیڈر ایچ وی شسشادری گرجے "اب یہاں سے کوئی نہیں ہٹے گا،" وہ

عام طور پر نرم مزاج سمجھے جاتے ہیں، لیکن اس وقت بہت سخت انداز میں چنگھاڑ رہے تھے: "ہم نے سنا ہے کہ مرکز ہم سے ٹکرانے کے لئے ملٹری بھیج رہا ہے ہم انہیں اپنی طاقت دکھا دیں گے"۔ سنگھل چلا رہے تھے: "ادھر جانے والی تمام سڑکیں بلاک کر دو" یہاں تک کہ وہ ان مقامات کے نام بھی لے رہے تھے جہاں سے سڑکیں بند کرنی تھیں اور بھول گئے کہ وہ تو بہت پہلے ہی بند کی جا چکی تھیں۔

اڈوانی اور جوشی وہاں کھڑے ہوئے تھے نہ انہوں نے بھیڑ سے مسجد چھوڑ دینے کی اپیل کی اور نہ ہی دوسرے لیڈروں نے انہیں روکنے کے لئے کہا۔

جس وقت مسجد کے اوپر یہ کارروائی چل رہی تھی کچھ کارسیوک فوٹو گرافروں پر پل پڑے کیمرے چھین کر توڑ ڈالے گئے، کیمرہ والوں کو زدوکوب کیا گیا، بھیڑ کے موڈ کو دیکھتے ہوئے بہت سے صحافی رام شال اوڑھ کر جے شری رام کے نعرے لگاتے ہوئے کھسک گئے۔

۴ بجے شام کو بھیڑ نے وہاں سے مسجد کی اینٹیں یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے کر روانہ ہونا شروع کر دیا۔ ابھی دو گنبدوں کو مسمار ہونا باقی تھا۔ اب گنبدوں کے اوپر والوں کی جان بچانے کے لئے تشویش ہوئی۔ سنگھل نے مائک پر قبضہ کر کے چیخنا شروع کیا: "یہ رام جنم بھومی میں داخل ہونے والے کارسیوکوں کے لئے خاص اعلان ہے۔ گنبدوں سے نیچے اتر آؤ وہ آپ کے اوپر گر پڑیں گے"۔ اب اڈوانی کا نمبر تھا پتہ چلا کہ سینٹرل فورسز فیض آباد سے چل چکی ہیں (حالاں کہ ایسا نہیں تھا) اڈوانی نے مائک کے ذریعہ نصیحت کی "گنبدوں سے نیچے اتر آؤ ورنہ گنبد کے اوپر چڑھے ہوئے لوگوں پر فائرنگ کر دی جائے گی"۔ کسی نے بھی بھیڑ کو مسجد خالی کرنے کے لئے نہیں کہا۔

کارسیوکوں کے لئے سنگھل کی تشویش بیجا نہیں تھی۔ ان میں سے چار دوسرے گنبدوں کے نیچے دفن ہو گئے۔ جو ۴ بج کر ۳۰ منٹ پر گرا۔ بیچ کا گنبد مورتیوں کے اوپر ۱۵ منٹ بعد گرا اس وقت بھیڑ اپنے ہاتھوں میں مورتیاں لئے ہوئے ناچ رہی تھی۔ دان دکشنا کے لئے رکھا بکس کھول کر خالی کر دیا گیا تھا۔ تمام رقم لوٹ لی گئی تھی۔

۵ گھنٹے سے بھی کم وقت میں مسجد ملبہ کا ڈھیر بنا دی گئی تھی، لیکن ابھی تو بہت کام باقی تھا۔

باہر نکلنے کے لئے مین گیٹ پر ر لم کتھا پارک کے پاس مرد اور عورت ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دوسرے کارسیوکوں کو وہاں سے جانے سے روکنے کے لئے زنجیر بناکر کھڑے ہو گئے۔ ملبہ صاف کرنا تھا اور کم از کم ایک عارضی مندر کھڑا کرنے کے لئے فوری طور پر تعمیر شروع کرنی تھی اس سے کوئی مطلب نہیں بعد میں کیا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ اسے گرانے کی کوئی جسارت نہیں کرسکتا ملبہ بہت تیزی کے ساتھ ٹریکٹر ٹرالیوں کے ذریعے جایا جانے لگا۔ ۵ بج کر ۴۵ منٹ پر گربھ گرہ کا اصل فرش پھر نظر آنے لگا تھا۔

جس وقت ہم فیض آباد کے لئے چلے ہم نے راستے میں دو چھوٹی مسجدوں کو مسمار ہوتے دیکھا پولیس والوں کی ایک پلاٹون ایک مسجد کے پاس منہدم کرنے والوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی تھی۔ انہوں نے اس اکیلے کانسٹبل کے ساتھ جانے کیا سلوک کیا ہوگا جس نے بابر کی آخری لڑائی لڑی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوگا تو وہ اپنے کارنامے کے لئے کبھی کسی ایوارڈ یا انعام کا دعویٰ بھی نہیں کرسکے گا

۷ر دسمبر

مسجد کا کہیں کوئی نشان بھی نہیں ہے۔ رات بھر میں وہاں جمع تمام ملبہ صاف کر دیا گیا کچھ کارسیوک ٹیلے کے اوپر چٹانیں توڑ توڑ کر نکال رہے تھے۔ وہ مندر کی علامات اور نشانیاں تلاش کر رہے تھے کھدائی اوپر کی سطح تک ہی کی گئی تھی کہ کچھ کھدے ہوئے اور منقش ماربل کے ٹکڑے نکل آئے۔ مرد اور عورت کارسیوکوں کا ایک وفادار گروپ مندر تعمیر کر رہا تھا۔ اینٹ اور گارا پہنچانے کے لئے وہ لوگ انسانی زنجیر بنائے ہوئے تھے۔ ٹینک اور کنکریٹ کے چبوترے پر چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ٹیلے کے اوپر واقع گربھ گرہ پر فرش پر مرمت کی جا رہی تھی اور اس کے ارد گرد ایک دیوار بھی تعمیر کی جا رہی تھی۔ رات بھر میں دیوار پر کنکریٹ کی کئی تہیں جمائی جا چکی تھیں۔

اجودھیا کے سیکڑوں لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے جو واقعات کے اس سلسلہ پر بہت ہی شاداں و فرحاں تھے۔ وشو ہندو پریشد کے ایک درمیانی قسم کے ورکر نے ہمارے ہاتھ پکڑ کر دبائے تو ہم نے اس سے پوچھا کہ "اچھا ایمانداری سے یہ بتاؤ کہ کیا یہ سب کچھ پہلے سے تیار منصوبے کے تحت ہوا؟" جس وقت اس نے ایمانداری کے ساتھ جواب دیا اس وقت اس کے

ہاتھوں کا دباؤ اور بھی بڑھ گیا۔ کہنے لگا: "یہ وہ ہے جو میں چاہتا تھا، یہ وہ ہے جو آپ چاہتے تھے، یہ وہ ہے جو ہر کوئی چاہتا تھا، یہ سب کچھ ہمارے دل کی دھڑکن کے عین مطابق ہوا اور حقیقت میں یہ سب پہلے سے تیار منصوبے کے عین مطابق ہے۔"

۸ ر دسمبر

۷ ر دسمبر کی شام میں بھی سینٹرل فورسز کے آگے بڑھنے کی افواہوں کی تصدیق کی کوئی شہادت نہیں۔ پھر ہم نہیں جانتے کہ سی آر پی ایف کے چار ڈپٹی کمانڈنٹ نے شام کے تین بجے کے قریب جائے واردات کا معائنہ کیا۔ علاقہ کو کنٹرول میں لینے کے لئے آرڈر اگلے دن صبح تین بجے بالکل اس وقت آیا جب گربھ گرہ کے اردگرد دیوار بالکل مکمل ہو چکی تھی اور بانس بلیوں کے اوپر شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ ۳ بج کر ۵۰ منٹ پر سی آر پی ایف کی ۹ کمپنیاں جن میں چھ ریپڈ ایکشن فورس کی کمپنیاں بھی شامل تھیں، فیض آباد سے روانہ ہوئیں۔ مندر کی تعمیر کے انچارج رام جی گپتا نے بتایا کہ وہ تقریباً ۴ بجے یہاں پہنچے۔ اس وقت گربھ گرہ میں ۵۰۰ کار سیوک تھے کچھ سادھو کیرتن کر رہے تھے۔ سامنے کا میدان خالی ہو چکا تھا لیکن تقریباً ایک ہزار لوگ تھوڑے فاصلے پر کیرتن کر رہے تھے۔

فورسز کے سربراہ اور ایک سو آٹھویں ریپڈ ایکشن فورس بٹالین کے کمانڈر پی ایم سرسوت کا کہنا ہے کہ "خالی کرنے میں عورتوں نے زیادہ وقت لگایا، پلیٹ فارم پر جمع مرد تو اپنی جان بچا کر بھاگ گئے۔

کارسیوکوں کو ہٹانے کے لئے صرف ۶ آنسو گیس کے گولوں اور ہلکے لاٹھی چارج سے کام چل گیا۔ ٹینٹوں اور آس پاس کے مندروں پر بھی چھاپے مارے گئے اور تقریباً ۳۰ ہزار کارسیوکوں کو بھگا دیا گیا اور شاہراہوں کے ذریعہ گھروں کو روانہ کر دیا گیا۔ آپریشن ۲۵ منٹ میں پورا ہو گیا۔"

۱۰ بج کر ۳۰ منٹ پر اس ٹیلہ پر معمول کے مطابق پوجا ہو رہی تھی باقی پورا ملک جل رہا تھا۔

(ہفت روزہ "دیک"، نئی دہلی کی رپورٹ)

پارلیمنٹ میں مذمتی قرارداد منظور

۱۶ر دسمبر ۹۲ء

قرارداد کا متن

یہ ایوان پُر زور اور دو ٹوک لفظوں میں وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس اور بجرنگ دَل کی شہہ پر اجودھیا میں بابری مسجد کی بے حرمتی اور انہدام کی مذمت کرتا ہے جس کے نتیجے میں ملک بھر میں فرقہ وارانہ تشدد برپا ہوا۔ یہ مذموم کارروائی نہ صرف سپریم کورٹ کے احکام کی خلاف ورزی ہے بلکہ ملک کی سیکولر بنیادوں پر حملے کے مترادف ہے۔

یہ ایوان اجودھیا کے واقعات پر اپنے صدمے کا اظہار کرتا ہے اور اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ ملک کی سیکولر اور جمہوری اقدار اور قانون کی بالادستی کے لئے مسلسل کوششیں جاری رکھے گا۔ یہ ایوان اجودھیا کے واقعات کے نتیجے میں ملک کے مختلف علاقوں میں تشدد کے شکار افراد کے ساتھ ہمدردی اور رنج کا اظہار کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ متاثرہ افراد کی باز آبادکاری کے لئے تمام ضروری اقدام کرے، ایوان نے لوگوں سے امن اور فرقہ وارانہ اتحاد قائم رکھنے کی اپیل کی ہے۔

متنازعہ آراضی تحویل میں لینے اور ٹرسٹ بنانے کا حکومتی فیصلہ

۲۷ر دسمبر کو مرکزی حکومت نے اجودھیا میں ان تمام متنازعہ آراضی کو تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا ہے جن کے بارے میں الٰہ آباد ہائیکورٹ میں مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔

مرکز نے یہ بھی طے کیا ہے کہ وہ صدر جمہوریہ سے درخواست کرے گا کہ وہ اس مسئلہ پر
سپریم کورٹ سے رائے حاصل کریں کہ کیا جہاں بابری مسجد تھی وہاں کسی مندر کا وجود تھا یا نہیں؛
اور اس علاقے کو جس پر انہدام سے پہلے بابری مسجد قائم تھی، چھوڑ کر تحویل میں
لئے گئے علاقے کو رام مندر اور مسجد تعمیر کرنے کے لئے دو ٹرسٹوں کے حوالہ کر دیا
جائے گا جو اسی مقصد کے لئے قائم کئے جائیں گے۔ سپریم کورٹ سے رائے آئین کی دفعہ
۱۴۳ کے تحت مانگی جائے گی۔ صدر جمہوریہ ہند نے ۷ جنوری ۹۳ء کو اس سلسلے میں اپنا
آرڈیننس بھی جاری کر دیا۔

اجودھیا میں حالات معمول پر آنے کے بعد

نماز کی اجازت

اورنگ آباد۔ ۲۹ دسمبر (ی ان ا) وزیر داخلہ مسٹر ایس بی چوان نے کہا کہ اجودھیا میں
نظم و نسق کی صورت حال معمول پر ہو جائے تو مقامی انتظامیہ کے ذریعہ بابری مسجد منہدم
ہونے کی جگہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔
اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ رام للا کے درشن
کی اجازت مقامی انتظامیہ نے دی ہے اور مرکزی حکومت کا اس میں کوئی رول نہیں ہے
انہوں نے کہا کہ جس طرح ہندوؤں کو درشن کی اجازت دی گئی ہے اسی طرح حالات معمول
پر آنے پر مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔
بہار میں بودھ گیا کی صورت حال پر وزیر داخلہ نے بہار حکومت کو انتباہ دیا کہ اگر
وہ مسئلہ جلد حل کرنے میں ناکام ہو گئی تو خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بابری مسجد

۱۵۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک

۱۵۲۸ء۔ سلطان ظہیر الدین محمد بابر (ہندوستان میں آمد ۹۳۳ھ وفات ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) کے حکم سے میر باقی اصفہانی نے بابری مسجد کی تعمیر کی جس کا تاریخی نام "بود خیر باقی" (۹۳۵ھ) ہے۔

۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) منہدم مساجد کی واگزاری کے لئے شاہ غلام حسین اور مولانا امیر علی امیٹھوی کی تحریک جہاد۔ بکسر کی جنگ (اکتوبر ۱۷۶۴ء) کے بعد اودھ پر انگریزوں کے تسلط اور ان کی جھوٹی تاریخ نویسی و فتنہ انگیزی کی وجہ سے ہندو بیراگیوں نے کئی ایک مساجد و مقابر کو شہید کر ڈالا تھا۔

۱۸۵۸ء۔ بیگ سنگھ نامی ایک ہندو نے بابری مسجد کے محراب و منبر کو نقصان پہنچایا جس پر وہاں کا تھانیدار معطل ہوا اور بیراگیوں پر جرمانہ عائد ہوا۔

۱۸۶۰ء۔ بابری مسجد کا رجسٹریشن ہوا۔ اقبال سنگھ نامی ایک ہندو نے بابری مسجد کے قریب ہی ایک چبوترہ بنا لیا۔ انگریزوں نے چبوترہ باقی رکھا۔ ہنومان گڑھی کے مہنت ہری داس نے مسجد سے متصل اپنا مکان بنانا چاہا جسے روک دیا گیا۔ کچھ انتہا پسندوں نے مسجد کے اندر ہندوانہ جھنڈا لہرانا چاہا مگر انہیں مسجد سے باہر کر دیا گیا۔ ٹھیک اذان کے وقت مہنتوں نے سنکھ بجانا شروع کیا۔ محمد اصغر امام بابری مسجد نے اس کے خلاف حکومت کو درخواست دی۔

۱۸۷۰ء۔ صحن مسجد پر قبضہ کرنے کے لئے مسجد کی ایک دیوار توڑ کر مہنتوں نے کچھ ہنگامہ برپا کیا۔

۱۸۵۷ء۔ کمشنر اجودھیا پی کارنیگی نے مسلمانوں کو پریشان اور ہندوؤں کو مشتعل کرنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت یہاں تین اہم مندر موجود تھے۔ (تحصیل

فیض آباد ضلع فیض آباد کا ایک تاریخی خاکہ۔ مطبوعہ ۱۸۷۰ء)
۱۸۷۷ء۔ فیض آباد گزیٹر میں انگریزوں نے یہ درج کیا کہ بابر کے دور میں رام جنم بھومی تو ڈکر بابری مسجد کی تعمیر کی گئی۔ (از ایچ آر نیولے۔ مطبوعہ ۱۹۰۵ء)
۱۸۸۳ء۔ رام جنم استھان کے نام سے صحن مسجد میں راتوں رات ایک چبوترہ بنادیا گیا۔
۱۸۸۵ء۔ ۱۹ر جنوری کو مہنت رگھوبیر داس نے جج فیض آباد کی کورٹ میں (مقدمہ نمبر ۲۸۰/۶۱ آف ۱۸۸۵ء) ایک مقدمہ دائر کیا کہ پجاریوں کی سہولت کے لئے رام جنم استھان کے چبوترہ پر پجاریوں کی سہولت کے لئے ۱۷×۲۱ کا ایک مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ پنڈت ہری کشن سب جج فیض آباد نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء میں اس مقدمہ کو خارج کردیا۔
۲۶ر مارچ ۱۸۸۶ء۔ مذکورہ فیصلہ کے خلاف جو اپیل ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء ہی کو داخل کی گئی تھی اسے خارج کردیا گیا۔ اور بابری مسجد میں حسب دستور سابق نماز و عبادت کا سلسلہ جاری رکھا۔
۱۹۳۴ء۔ بابری مسجد کو کچھ شرپسندوں نے نقصان پہنچایا، لیکن حکومت نے اپنے مصارف سے اس کی دوبارہ تعمیر کی۔
۱۹۳۶ء یوپی مسلم ایکٹ کے تحت بابری مسجد یوپی سنی سنٹرل بورڈ آف وقف کے ماتحت رجسٹرڈ ہوئی۔ کمشنر اوقاف کی رپورٹ گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۲۶ر فروری ۱۹۴۴ء میں بھی اسے سُنّی وقف درج کیا گیا۔
۱۳ر نومبر ۱۹۴۹ء۔ قناتی مسجد کی پرانی بنیاد پر چبوترہ بنادیا گیا اور بابری مسجد کے آس پاس کی قبروں کو کھود ڈالا گیا۔
۲۲/۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء۔ درمیانی شب میں چوری چھپے بابری مسجد کے اندر رام چندر کی مورتیاں رکھ دی گئیں۔ ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام نے یہ مورتیاں اپنے چیلوں سے رکھوائیں جس کے خلاف ماتو پرشاد کانسٹبل نے تھانہ میں رپورٹ درج کرائی۔ پھر سٹی مجسٹریٹ فیض آباد نے مسجد اور اس سے متصل گنج شہیداں کو قرق کرلیا۔ اور ایک ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا لگادیا اور بابری مسجد کے اندر اذان و نماز سے مسلمانوں کو محروم کردیا گیا۔

بابری مسجد

دسمبر ۴۹ء سے دسمبر ۹۲ء تک

۲۲ر۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں فیض آباد کے جے، سی، ایس جج شری کرشن کمار نیر کے وقت میں کچھ ہندوؤں نے بابری مسجد کے اندر گھس کر مورتیاں رکھ دیں۔

۲۴ر اپریل ۱۹۵۰ء حکومت یوپی کی طرف سے شری جے این اوگرہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے سول جج فیض آباد کے کورٹ میں مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء (گوپال سنگھ وشارد بنام ظہور احمد وغیرہ) ایک تحریری بیان دیا کہ ۲۲ر۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں غلط طریقہ سے بابری مسجد میں مورتی رکھی گئی۔ اس سے پہلے یہاں باقاعدہ نماز ہوا کرتی تھی۔ یہی موقف ریاستی حکومت نے مقدمہ نمبر ۲۵ سنہ ۱۹۵۰ء (شری پرم ہنس رام چندر داس بنام ظہور احمد وغیرہ) میں بھی اختیار کیا۔ اسی مقدمہ میں جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے ریاستی حکومت کی طرف سے ایک تحریری بیان بھی داخل کیا تھا لیکن سنہ ۱۹۵۰ء ہی میں بابری مسجد میں تالا ڈال دیا گیا تھا۔

۷ر۸ر اپریل ۱۹۸۴ء کو دہلی میں مذہبی ہندوؤں کی ایک میٹنگ میں تالا کھلوانے کا مطالبہ کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۴ء سے شروع ہو کر اتر پردیش میں دو سال تک رتھ یاترائیں نکالی گئیں۔

یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تالا کھولنے کا حکم دے دیا۔ عدالتی کارروائی صرف پانچ دن میں مکمل ہوئی اور جج نے حکومت کو یہ بھی ہدایت دی کہ اس متنازعہ عبادت گاہ پر تعینات فورس ہٹالی جائے۔ اپیل اومیش چندر پانڈے نے دائر کی تھی جو اس قضیہ میں کبھی فریق مقدمہ نہ تھا۔

۱۴ر فروری ۸۶ء کو بابری مسجد کا تالا صرف پوجا کے لئے کھولنے کے خلاف پورے

ملک میں یومِ سیاہ منایا گیا۔

۲۰؍فروری ۱۹۸۶ء کو لکھنؤ میں کُل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس کی طرف سے تین سو تیرہ علماء و مجاہدین نے بابری مسجد کی بازیابی کے لیے گرفتاری دی۔

۲۱/۲۲؍دسمبر ۱۹۸۶ء دہلی میں بابری مسجد کانفرنس[1] ہوئی۔

۲۴؍جنوری ۱۹۸۷ء بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے تقریباتِ ۲۶؍جنوری کے بائیکاٹ کی اپیل واپس لے لی۔

یکم فروری ۱۹۸۷ء یوم بابری مسجد بند پورے ملک میں منایا گیا۔

۳۰؍مارچ ۱۹۸۷ء۔ مسلمانانِ ہند نے لاکھوں کی تعداد میں بوٹ کلب دہلی کے میدان میں جمع ہوکر بابری مسجد کے تحفظ اور اس کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔

۲۲/۲۳؍مئی ۱۹۸۷ء۔ میرٹھ میں ہولناک فساد شروع ہوا۔

۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کے لیے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی طرف سے اجودھیا مارچ کا اعلان، جس پر عمل نہ ہو سکا۔

نومبر ۱۹۸۸ء۔ رابطہ کمیٹی اور ایکشن کمیٹی نام پر تحریک بابری مسجد دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

یکم فروری ۱۹۸۹ء کو ہندو مذہبی رہنماؤں کی الٰہ آباد میں ایک اہم میٹنگ ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ ۹؍نومبر ۱۹۸۹ء کو مندر کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔

جون ۱۹۸۹ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ نے حکومت سے مانگ کی کہ متنازعہ عمارت ہندوؤں کے حوالہ کی جائے۔

ستمبر ۱۹۸۹ء۔ بدایوں میں ٹرین پر حملہ کر کے تقریباً دو سو مسلمان شہید کر دیئے گئے۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء۔ بھاگل پور میں ہولناک فساد ہوا۔

۲؍نومبر ۱۹۸۹ء کو کاشی کے کچھ سادھو بنیاد کے لیے جگہ کا تعین کرنے اجودھیا پہنچے۔

---

[1] اسی کانفرنس میں یہ تجویزیں پاس ہوئیں (۱) تقریبات ۲۶؍جنوری ۸۷ء کا بائیکاٹ (۲) یکم فروری ۸۷ء کو بابری مسجد بند کا دن (۳) ۳۰؍مارچ ۸۷ء کو بوٹ کلب پر لاکھوں مسلمانوں کا مظاہرہ (۴) اجودھیا مارچ (جس کے لیے بعد میں ۱۴؍اکتوبر ۸۸ء کی تاریخ متعین ہوئی)

۹ر نومبر ۱۹۸۹ء کو وزیر اعظم راجیو گاندھی کے زمانے میں رام جنم بھومی کا شیلانیاس بابری مسجد کے قریب متنازعہ زمین پر ہوا۔ بہار کے ایک آدی باسی کامیشور چوپال نے پہلی اینٹ رکھی۔

۶ر فروری ۱۹۹۰ء کو وزیر اعظم وی پی سنگھ نے مکتی یگیہ سمیتی کو بات چیت کے لئے مدعو کیا۔

۲ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو مسٹر ایل کے ایڈوانی نے اعلان کیا کہ وہ آٹھ ریاستوں سے رتھ یاترا کرتے ہوئے ۳۰ر اکتوبر ۹۰ء کو کار سیوا کے لئے اجودھیا پہنچیں گے۔

۲۵ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو ایڈوانی نے سومناتھ (گجرات) کے مندر سے یاترا شروع کی۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن نے ایک آرڈی ننس جاری کر کے اس جگہ کو ایکوائر کر لیا جس میں بابری مسجد واقع ہے۔

۲۳ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ایڈوانی کی رتھ یاترا سمستی پور بہار پہونچی اور وزیر اعلیٰ لالو پرشاد یادو کے حکم سے انہیں وہیں گرفتار کر لیا گیا۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ہندوؤں نے بھارت بند کا اعلان کیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے صدر جمہوریہ کو مطلع کیا کہ وہ راشٹریہ مورچہ حکومت سے حمایت واپس لے رہی ہے۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کے دور میں کار سیوک بابری مسجد کے گنبد پر چڑھ گئے اور بھگوا جھنڈا لہرایا۔

۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو مسلم پرسنل لا بورڈ، بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور ملک کے اہم مذہبی رہنماؤں کا اجلاس۔

۶ر دسمبر ۹۰ ۱۹ء کو اجودھیا میں کار سیوکوں کا اجتماع۔

۷ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس کی الٰہ آباد میں ایک اہم میٹنگ، جس میں بابری مسجد کی بازیابی کا مطالبہ اور متنازعہ اراضی پر شیلانیاس پر تشویش اور دیگر متعلقہ مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔

۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو سپریم کورٹ نے متنازعہ زمین پر کسی مستقل تعمیر کے خلاف

حکم امتناعی جاری کر دیا۔

۷/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ریاستی بھاجپا حکومت نے بابری مسجد سے متصل متنازعہ ۷۷ء۲ ۔ایکڑ آراضی کو ایکوائر کر لیا۔

۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو وشو ہندو پریشد کے ذریعہ مندر بنانے کے لئے بھومی پوجن۔

۶/ جنوری ۱۹۹۲ء کو وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے وارانسی میں اعلان کیا کہ بابری مسجد کی جگہ جلد ہی مندر کی تعمیر شروع کی جائے گی۔

۲۱/ مارچ ۱۹۹۲ء کو ریاستی بھاجپا حکومت نے رام کتھا پارک کے قریب ۴۲ ایکڑ زمین وشو ہندو پریشد کو دی۔

۲۲/ مارچ ۱۹۹۲ء کو ساکشی گوپال مندر، سمترا بھون وغیرہ گرائے گئے۔

۲۳/ مارچ ۱۹۹۲ء کو مرکز کے ذریعہ متنازعہ جگہ کو قبضہ میں لینے کی وارننگ۔

۷/ اپریل ۱۹۹۲ء کو جنتا دل صدر مسٹر بومئی کی قیادت میں ایک کُل جماعتی وفد کا دورہ ایودھیا۔

۹/ مئی ۱۹۹۲ء کو مسٹر بومئی نے اپنی رپورٹ وزیر داخلہ کو پیش کی۔

۲۳/ جون ۱۹۹۲ء میں قومی یک جہتی کونسل کی میٹنگ جس میں بابری مسجد پر حملہ اور اس کے انہدام کا خطرہ ظاہر کیا گیا۔

۸/ جولائی ۱۹۹۲ء کو مندر کی تعمیر نو شروع کرنے کا پریشد کی طرف سے اعلان۔

۹/ جولائی ۱۹۹۲ء سے باقاعدہ تعمیری کام شروع۔ اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں زبردست ہنگامہ۔

۱۲/ جولائی ۱۹۹۲ء کو سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی تعمیر کی گئی تو وہ گرائی جا سکتی ہے۔

۱۷/ جولائی ۱۹۹۲ء کو کار سیوکوں نے تعمیراتی کام روکنے سے متعلق عدالتی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

۲۱/ جولائی ۱۹۹۲ء کو الٰہ آباد ہائیکورٹ کی لکھنؤ بنچ نے تحویل شدہ ۷۷ء۲ ایکڑ آراضی

میں کسی قسم کی تعمیراتی سرگرمی پر پابندی عائد کردی۔

۲۵؍جولائی ۱۹۹۲ء کو وزیر اعظم مسٹر نرسمہاراؤ کی اس یقین دہانی پر کہ چار ماہ کے اندر اس مسئلہ کا حل نکال لینے کی کوشش کی جائے گی۔ متنازعہ جگہ پر تعمیراتی کام روک دیا گیا۔

۱۵؍اگست ۱۹۹۲ء کو لال قلعہ دہلی سے وزیر اعظم نرسمہاراؤ کا اعلان کہ ہم بابری مسجد کو کسی طرح نقصان پہنچائے بغیر عظیم الشان رام مندر کی تعمیر کے حق میں ہیں۔

۳؍اکتوبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں کے درمیان مذاکرات کا دوبارہ آغاز ہوا۔

۳۰؍اکتوبر ۱۹۹۲ء کو وشو ہندو پریشد کی دھرم سنسد نے ۶؍دسمبر ۹۲ء کو اجودھیا میں کارسیوا شروع کرنے کا اعلان کردیا۔

۸؍نومبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے درمیان بات چیت ٹوٹ گئی۔

۲۳؍نومبر ۱۹۹۲ء کو قومی یک جہتی کونسل نے قرارداد پاس کرکے وزیر اعظم کو آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہر ضروری قدم اٹھانے کا اختیار دے دیا۔

۲۷؍نومبر ۱۹۹۲ء کو مرکزی فورس اجودھیا بھیج دی گئی۔

۲۸؍نومبر ۱۹۹۲ء کو یوپی سرکار کی یہ یقین دہانی سپریم کورٹ نے مان لی کہ متنازعہ جگہ پر کوئی تعمیراتی کام نہیں ہوگا۔

۲۹؍نومبر ۱۹۹۲ء کو سپریم کورٹ کی ہدایت پر مرادآباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اجودھیا میں مشاہد مقرر کیا گیا۔

۴؍دسمبر ۱۹۹۲ء تک تقریباً دو لاکھ کارسیوک اجودھیا پہنچ گئے۔

۵؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو وشو ہندو پریشد نے مزید کارسیوکوں کو اجودھیا نہ آنے کی اپیل کی۔

۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن میں کارسیوکوں نے بابری مسجد پر حملہ کرکے پانچ گھنٹے میں اسے مکمل طور پر شہید کردیا۔ اور عارضی تعمیر کرکے مسجد کی زمین پر مورتی رکھ دی۔

پولیس اور فوج نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی۔

وزیر اعلیٰ یوپی نے اس حادثہ کے بعد فوراً استعفیٰ دیا پھر مرکزی حکومت کی سفارش پر شام تک یوپی میں صدر راج نافذ کر دیا گیا۔

<u>۷/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u> کو پورے برصغیر میں لوٹ مار قتل و غارت گری اور خون خرابہ کا ایسا بازار گرم ہوا جس کی نظیر ۱۹۴۷ء کے بعد نہیں ملتی۔ بھاجپا کے بڑے لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔

<u>۸/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u> کو مرکزی حکومت کی طرف سے مسجد کی تعمیر نو کا اعلان۔

<u>۱۰/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u>۔ آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، جماعت اسلامی اور اسلامی سیوک سنگھ پر فرقہ پرستی کے الزام میں مرکز کی طرف سے پابندی عائد کر دی گئی۔

<u>۱۳/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u>۔ مدھیہ پردیش، راجستھان، ہماچل پردیش کی حکومتیں برطرف کر دی گئیں۔ ان کے وزرائے اعلیٰ کا تعلق بھاجپا سے تھا۔

<u>۱۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u> کو پارلیمنٹ میں بابری مسجد کے انہدام کے خلاف قرارداد پاس۔

<u>۲۵/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u> کو بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی نے اپنے انضمام کا اعلان کیا۔

<u>۲۷/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u> کو مرکزی حکومت نے منہدم مسجد کی جگہ کے علاوہ سبھی متنازعہ آراضی کو سرکاری تحویل میں لے کر مسجد اور مندر کی تعمیر کے لئے دو ٹرسٹ بنانے کا اعلان کیا۔

<u>۳۱/ دسمبر ۱۹۹۲ء</u>۔ ایکشن کمیٹی فیض آباد کی اپیل پر عیدگاہ فیض آباد میں جمع ہو کر مسلمانوں نے بابری مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے اجودھیا جانے کا اعلان کیا جس کے بعد ایک ہزار مسلمانوں کو گرفتار کر کے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا۔

ماتا ٹیلہ (جھانسی) سے بی جے پی صدر مرلی منوہر جوشی نے تحریری بیان دیا کہ بابری مسجد ٹوٹنے پر انہیں کوئی افسوس نہیں۔ رام مندر وہیں بنے گا جہاں بابری مسجد تھی۔

ہنومان گڑھی اور بابری مسجد
ایک غلط فہمی کا ازالہ

۱۸۵۵ء کے ہنومان گڑھی کے واقعہ کے بعد بہت سے لوگوں نے غلطی سے بابری مسجد اور جنم استھان کا جھگڑا سمجھ لیا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مائیکل فشر نے بھی یہ غلطی کی ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں نے جان بوجھ کر یا انجانے میں اس الجھن کو باقی رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو یہ ثابت کرنے کے لئے بھی استعمال کیا ہے کہ ہندو کافی عرصہ سے بابری مسجد کے رام جنم استھان ہونے کے دعویدار رہیں۔ درحقیقت یہ ۱۸۵۵ء کے واقعات کی غلط تفہیم ہے۔ یہ جھگڑا ہنومان گڑھی مندر کے لئے تھا۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں نہیں تھا۔ اس تنازعہ کے سلسلے میں ایک انگریز افسر نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

• دونوں فرقوں میں غلط فہمی کا سبب یہ تھا کہ شاہ اور ان کے پیروکاروں کا موقف یہ تھا کہ ہنومان گڑھی کے بہت قریب پہلے ایک مسجد بھی اور بیراگی فقیروں نے اسے یا تو گرادیا تھا یا اس کی شکل بگاڑ کر اسی پر جو تعمیر بھی اسے اپنی عمارتوں کا حصہ بنالیا تھا جب کہ بیراگیوں کا کہنا ہے کہ وہاں اب یا پہلے کبھی کوئی مسجد نہ تھی۔

ہنومان گڑھی کے واقعہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس وقت ہندوؤں کے ذہنوں میں بابری مسجد اور رام جنم استھان کے درمیان کسی تعلق کا شائبہ تک نہ تھا۔ حالاں کہ بیراگی اس مسجد میں گھس گئے تھے جس میں مسلمانوں نے پناہ لی تھی مگر انہوں نے اس پر قبضہ نہیں کیا نہ ہی انہوں نے اس پر کوئی دعویٰ کیا۔ اس کی بجائے وہ فوراً ہنومان گڑھی میں واپس چلے گئے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ تحقیقات کے دوران بھی کسی ہندو نے مسجد کی جگہ پر پہلے کبھی مندر ہونے کا ذکر نہیں کیا انہوں نے ہنومان گڑھی پر مسلمانوں کے دعوے کے جواب تک میں ایسا

نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس جنم استھان مندر کے سلسلہ میں مقامی روایات کا ذکر انگریز افسروں نے کیا ہے وہ ۱۸۵۵ء تک عام نہ تھیں۔ لیکن ہنومان گڑھی کے واقعے نے اس خیال کو پیدا کیا اور تقویت پہنچائی۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی شروعات کیسے ہوئی مگر گمان غالب ہے کہ ہنومان گڑھی مندر پر مسلمانوں کے دعوے کو کمزور بنانے کے لئے اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہنومان گڑھی کے مہنت نے غلام حسین اور امیر علی کی کارروائیوں کے اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا اور مندر کے قریب مسجد بنانے کی نواب کی تجویز اس کے لئے تشویشناک تھی اسے شک تھا کہ اگر مستقبل میں ایجی ٹیشن دوبارہ شروع ہوا تو ضروری نہیں کہ حکومت کا فیصلہ ہندوؤں کے حق میں جائے اس لئے مسلمانوں کے قبضہ کے علاقہ پر ایک جوابی دعوی مندر پر مسلمانوں کے قبضہ کی کوشش کا موثر توڑ بن سکتا ہے۔ اس طرح ایک دفاعی حکمت عملی کے طور پر جنم استھان کے مطالبہ کا جنم ہوا۔

۱۸۵۷ء کے فوراً بعد مہنت نے بابری مسجد کے احاطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے ایک چبوترا تعمیر کرا لیا۔ مقامی مسلمانوں نے مہنت کی اس کوشش کی مخالفت کی۔ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو بابری مسجد کے خطیب اور موذن مولوی محمد اصغر نے مجسٹریٹ کو یہ درخواست دی کہ بیراگیوں نے مسجد سے ملحق ایک چبوترا تعمیر کر لیا ہے اور انہوں نے مسجد کی دیوار پر "رام رام" لکھ دیا ہے۔ اسی طرح کی شکایتیں ۱۸۶۰ء، ۱۸۷۷ء، ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء میں بھی کی گئیں۔ ۱۸۸۵ء میں مہنت نے زمین پر قانونی حق حاصل کرنے کے لئے ایک مقدمہ دائر کر دیا جس میں چبوترے پر ایک مندر تعمیر کرنے کی اجازت بھی مانگی گئی تھی مگر اس کا مقدمہ اور اپیلیں خارج کر دی گئیں۔ مسجد کے احاطہ میں زمین کی ملکیت پر اس کا دعوی بھی جوڈیشیل کمشنر نے رد کر دیا۔ اس کے باوجود یہ خیال مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ گیا کہ مسجد ہندوؤں کی مقدس جگہ پر تعمیر کی گئی تھی اور یہ ایک متنازعہ جگہ ہے۔

اجودھیا کی مانی ہوئی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسے جنم استھان کہا جاتا ہے وہی رام کے جنم کی جگہ ہے۔ اور بابری مسجد کی جگہ کوئی مندر تھا۔

(مشہور مورخ کے این پانیکر کی تحقیق)